ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

مٹ نہیں سکتا کبھی مرد مسلماں

’’ہندوستان میں ہمارے ذمہ ایک خاص کام ہے، ایک مہم سپرد کی گئی ہے، اس مہم کی تکمیل کرنی ہے، ہمیں اس ملک میں اللہ کے دین کی طرف لوگوں کو بلانا ہے، ہمیں آخرت کی یادتازہ کرنی ہے، ہمیں بتانا ہے کہ کھانے پینے کے علاوہ بھی کچھ مقاصد اور کچھ حقائق ہیں، ہمیں بتانا ہے کہ کوئی ہے جو یہاں کا نظم و نسق چلا رہا ہے، ہم جانوروں کی طرح پیٹ پالنے اور زندگی کے دن پورے کرنے کے لیے نہیں آئے ہیں، بندگی کے لیے آئے ہیں، یہ کام ہر زمانہ میں رہے گا، اور ابھی تک کوئی قوم اور کوئی نسل ایسی پیدا بھی نہیں ہوئی جو ہم سے یہ چارج لے لے، یہ رحمت خداوندی اور حکمت الٰہی کے خلاف ہے کہ ہمارا یہاں سے بالکل خاتمہ کر دیا جائے۔‘‘

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

₹10/- | مركز الإمام أبي الحسن الندوي | MAR 18

دارعرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

بدگمانی وبدزبانی

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

’’رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں جب بعض منافقین کی شرارت سے امت کی سب سے بڑی مؤمنہ صدیقہ پر ایک نہایت گندی تہمت لگی اوراس کے چرچے پھیلے تو کلام مجید میں یہ دوآیتیں نازل ہوئیں؛

﴿لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْراً وَقَالُوا هَذَا إِفْكٌ مُّبِينٌ﴾

(جب تم لوگوں نے یہ گندی حکایت سنیں تھیں تو مسلمان مردوں اورعورتوں نے اپنے لوگوں سے متعلق گمان نیک سے کام کیوں نہ لیااورچھوٹتے ہی یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریح افتراء ہے)

﴿وَلَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُم مَّا يَكُونُ لَنَا أَن نَّتَكَلَّمَ بِهَذَا سُبْحَانَكَ هَذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ☆يَعِظُكُمُ اللَّهُ أَن تَعُودُوا لِمِثْلِهِ أَبَداً إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ﴾

(اور جب تمہارے کانوں تک یہ گندی حکایت پہنچی تھی اسی وقت تم نے یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ ہم کوایسی بات منہ سے بھی نہ نکالناچاہیے،معاذاللہ!یہ توبڑی سخت تہمت ہے،اللہ تمہیں حکم دیتاہے کہ اگرتم ایمان والے ہوتوایسی حرکت پھر ہرگز نہ کرنا)

خبر کے گڑھنے کاذکرنہیں،گڑھی ہوئی خبر کے صرف قبول کرنے اور بے سوچے سمجھے اس کے چرچے کرنے پر یہ ڈانٹ پڑ رہی ہے،کسی مسلمان پرافتراءکوتو کوئی مسلمان کیوں کرنے لگا،کسی افتراءکوقبول کرنااوراس کے اشاعت میں معین ہونا بھی ہرگز کسی مسلمان کا کام نہیں،ہوسکتا ارشاد ہوتا ہے کہ ایسی نامعقول روایتوں اور حکایتوں کے سننے کے ساتھ ہی انہیں رد کردینا چاہیےاورکسی مسلمان کی عزت پر جملہ سن کراسی وقت اس کے قبول کرنے سے صاف انکارکردینا چاہیے،وہ مسلمان کیسا جو دوسرے مسلمان کی دیانت پر،عزت پر،اخلاق پرحملہ ہوتے ہوئے دیکھےاور چپکا بیٹھا رہے یا یہ کہہ کراپنا پیچھا چھڑالے کہ سنا ایساہی تھا،اسے توفوراًاس کی تردیدکرنی چاہیے،بغیراس کے وہ مسلمان ہی کیسا؟اوراس کاایمان ہی کیا؟

آج دنیائے اسلام کے کسی گوشہ میں اس پرعمل ہے؟پبلک جلسے ہوں یا گھروں کے اندرتخلیہ کی صحبتیں،اخبارات کے مقالات ہوں یا خانگی خطوط،کہاں یہی چرچے یہی تذکرے نہیں کہ فلاں لیڈرقوم کاروپیہ کھاگیا،فلاں لیڈرانگریزوں سے مل گیا،فلاں لیڈرنے ہندوؤں سے رشوت لی،فلاں مولاناصاحب چھپے رستم نکلے،فلاں شاہ صاحب کی چوری پکڑی گئی،محلّہ کے چودھری صاحب کے جوہریوں کھل رہے ہیں،شہرکے قاضی صاحب کی یہ یہ حرکتیں ظاہرہوئیں،اس کا گھرجواریوں کااڈاہے، اس کے ہاں بہوبیٹیوں تک کی عزت کاٹھیک نہیں؟جہاں چارمسلمان جمع ہوئے نہ خداکاذکر،نہ رسول کا تذکرہ،نہ موت کی یاد، نہ آخرت کی فکر،بس غیبتیں ہیں تومسلمانوں کی اور بدگوئیاں ہیں تواپنے ہی بھائی بندوں کی،ایک ایک گھرکے پترے کھل رہے ہیں،اوردنیاجہاں کا کوئی عیب کوئی الزام ایسانہیں جوخودمسلمانوں ہی کی زبان سے مسلمانوں پرنہ لگ رہاہو،تہمتیں تراشنے والے مسلمان،انہیں پھیلانے والے مسلمان،نتیجہ رنجشوں،مقدمہ بازیوں،فوجداریوں کی صورت میں روزانہ موجود،لیکن زبان کوچاٹ ایسی پڑی ہوئی ہے کہ ساری تکلیفیں گوارہ،لیکن ان چرچوں اورتذکروں سے ہاتھ اٹھانا ناممکن۔‘‘

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو اور ہندی میں ایک ساتھ شائع ہونے والا

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

مرکز الامام أبی الحسن الندوی دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی (یوپی)

جلد: ۱۰ | مارچ ۲۰۱۸ء - جمادی الثانی ۱۴۳۹ھ | شمارہ: ۳

سرپرست: حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ (صدر، دارعرفات)

نگراں: مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی مدظلہ (جنرل سکریٹری، دارعرفات)

مجلس ادارت

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مفتی راشد حسین ندوی

عبدالسبحان ناخدا ندوی

محمود حسن حسنی ندوی

محمد حسن ندوی

معاون ادارت

محمد نفیس خاں ندوی

محمد ارمغان بدایونی ندوی

خود احتسابی

﴿إِنَّ اللّـهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ وَإِذَا أَرَادَ اللّـهُ بِقَوْمٍ سُوءً فَلَا مَرَدَّ لَهُ وَمَا لَهُم مِّن دُونِهِ مِن وَالٍ﴾

(کسی بھی قوم کی حالت کو اللہ اس وقت تک ہرگز نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ کرلے اور جب اللہ کسی قوم کے ساتھ برائی کا ارادہ کرلیتا ہے تو اس کے ٹلنے کی کوئی صورت نہیں اور اس کے علاوہ کوئی اس کا حمایتی بھی نہیں)

(الرعد: ۱۱)

فی شمارہ: -/Rs.10

Mail: markazulimam@gmail.com

سالانہ زرتعاون: -/Rs.100

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس، اے، آفسٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں، سبزی منڈی، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کرا کر دفتر "پیام عرفات" مرکز الامام أبی الحسن الندوي، دارِعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

فہرس

مسلمانوں کا فرض منصبی (اداریہ).....۳

.....بلال عبدالحی حسنی ندوی

مکی و مدنی زندگی.....۴

.....حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

دو خطرے- خارجی اور داخلی.....۶

.....حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی

عقل مندی کا تقاضا.....۸

.....مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ

توحید کیا ہے؟.....۱۰

.....بلال عبدالحی حسنی ندوی

صلاح و فساد کی بنیاد.....۱۳

.....عبدالسبحان ناخدا ندوی

میت کو غسل دلانے کے شرعی احکام.....۱۶

.....مفتی راشد حسین ندوی

خدا کا خوف.....۱۸

.....محمد ارمغان بدایونی ندوی

احساسِ مظلومیت کا مرض.....۱۹

.....محمد نفیس خاں ندوی

شافع محشر صلی اللہ علیہ وسلم

نتیجۂ فکر:- امیر مینائی لکھنوی

خلق کے سرور شافع محشر صلی اللہ علیہ وسلم
مرسل داور، خاص پیمبر صلی اللہ علیہ وسلم

نورِ مجسم، نیر اعظم، سرور عالم، مونس آدم
نوح کے ہمدم، خضر کے رہبر صلی اللہ علیہ وسلم

فخر جہاں ہیں عرش مکاں ہیں شاہِ شہاں ہیں، سیف زباں ہیں
سب پہ عیاں ہیں آپ کے جوہر صلی اللہ علیہ وسلم

قبلہ عالم کعبہ اعظم سب سے مقدم راز سے محرم
جانِ مجسم، روحِ مصور، صلی اللہ علیہ وسلم

دولت دنیا خاک برابر، ہاتھ کے خالی دل کے تونگر
مالک کشور تخت بہ افسر صلی اللہ علیہ وسلم

رہبر موسیٰ، ہادی عیسیٰ، تارک دنیا، مالک عقبیٰ
ہاتھ کا تکیہ، خاک کا بستر صلی اللہ علیہ وسلم

سروِ خراماں، چہرہ گلستاں، جبہہ تاباں، مہر درخشاں
سنبل پیچاں، زلف معنبر صلی اللہ علیہ وسلم

مہر سے مملو ریشہ ریشہ نعت امیرؔ اپنا ہے پیشہ
ورد ہمیشہ دن بھر شب بھر صلی اللہ علیہ وسلم

مدیر کے قلم سے

مسلمانوں کا فرض منصبی

بلال عبدالحی حسنی ندوی

یہ امت امت دعوت ہے اور یہی اس کی خیر امت ہونے کی کھلی نشانیوں میں سے ہے، دعوت ہی سے اس کی بقاء ہے، جو قومیں دعوتی مزاج رکھتی ہیں وہ زندہ رہتی ہیں، ورنہ وہ برف کی طرح پگھل جاتی ہیں، اس امت کو اللہ تعالیٰ نے قیامت تک زندہ رہنے کے لیے پیدا فرمایا ہے، اس لیے نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے دعوتی مزاج رکھنے والی ایک ایسی جماعت تیار کردی جس نے دنیا کے بڑے حصہ کو بہت کم مدت میں دعوت آشنا بنا دیا، ان کا ایک ایک فرد تحریک بن گیا، جو کام بڑی بڑی تحریکات نہیں کرسکتیں وہ کام ایک ایک فرد نے کر کے دکھا دیا، یہ امت جب تک اپنے دعوتی مشن کے ساتھ آگے بڑھتی رہی اس کو کوئی طاقت روک نہیں سکی، دعوت کی اس طاقت نے تسخیر عالم کا کام کیا، لیکن جب سے اس کی دعوتی اسپرٹ (Spirit) میں کمی آنے لگی، حالات بدلنے لگے، آہستہ آہستہ وہی امت جس کا نام سکۂ رواں کی طرح چلتا تھا، جس کے رعب سے سلطنتیں کانپتی تھیں، یورپ جس کی غلامی کو اپنے لیے قابل فخر سمجھتا تھا، جس کے ایجاد کردہ علوم وفنون پر آج کی ترقی کی بنیاد ہے، اس نے اپنا مقام کھو دیا، قومیں اس پر ٹوٹ پڑیں، اس کی طاقت تاش کے پتوں کی طرح بکھر گئی، خلافت اسلامیہ کا نشان مٹ گیا اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والے وہ حکام مسلط کردیے گئے جو پوری اسلامی تاریخ کے لیے کسی کلنک کے ٹیکہ سے کم نہیں۔

دعوت اپنوں میں ہو یا غیروں میں یہ ایک اہم ترین دینی فریضہ ہے، امت کے تحفظ وبقاء کا راز بھی اسی میں مضمر ہے، بقائے عالم کی موجودہ کوششوں میں یہ فکر بھی پیش کی جاتی ہے کہ ہر مذہب والا اپنے مذہب پر عمل کرے، کوئی کسی کو نہ روکے نہ ٹوکے، تاکہ ہر شخص آزادی کے ساتھ زندگی گزار سکے، اسلام میں اس کا تصور بھی ممکن نہیں، ہوسکتا ہے کہ کسی ضروری مصلحت کی خاطر کسی علاقہ میں محدود وقت کے لیے اس پر عمل کرلیا جائے لیکن اسلامی مزاج سے اس کا کوئی تعلق نہیں، بھلائی کی تلقین کرنا، اس کا ماحول بنانا، اس کو عام کرنے کی کوشش کرنا مسلمانوں کے فرائض منصبی میں داخل ہے، برائی کو برائی سمجھنا، اس کو برا کہنا، ماحول کو اس سے پاک کرنے کی کوشش کرنا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے، حدیث میں آتا ہے: ''تم میں جو برائی دیکھے وہ ممکن ہو تو ہاتھ سے روک دے، ورنہ زبان سے روک دے اور یہ بھی نہ ہوسکے تو دل سے اس کو برا سمجھے (اور روکنے کا عزم رکھے) اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔''

دعوت اسلامی کے یہ دونوں اجزاء ہیں، دعوت ان دونوں سے مرکب ہے، اس میں کسی ایک چیز پر زد پڑتی ہے تو دعوت ناقص رہ جاتی ہے، تقدیم و تأخیر کی جاسکتی ہے، حالات کی رعایت کی اجازت ہے، لیکن کتر وبیونت کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

موجودہ مسلم معاشروں میں یہ خرابی بڑھتی چلی جارہی ہے کہ برائیوں کو دیکھ کر دل نہیں کانپتا، اس کا احساس ختم ہوتا چلا جارہا ہے، وہ معاشرہ کسی مسلمان ملک کا ہو یا دوسرے ملک کی مسلم آبادیوں کا، کوئی برائی داخل ہوتی ہے پھر بڑھتے بڑھتے وہ سب کو اپنے لپیٹ میں لے لیتی ہے، ظاہری طور پر دیندار لوگ اس میں مبتلا ہوتے جاتے ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ پہلے ہی مرحلہ میں اس کے سد باب کی کوشش نہیں کی جاتی، یہ ایک ایسا خطرناک سلسلہ ہے جو ارتداد تک پہنچا سکتا ہے، اور اس دور میں اسلام دشمن طاقتوں نے یہی حربہ اختیار کیا ہے کہ مسلمانوں میں ایک ایک کر کے ایسی برائیاں عام کی جائیں کہ آہستہ آہستہ ان کا اسلامی تشخص تحلیل ہوکر رہ جائے اور کچھ عرصہ کے بعد ان کے اندر اس کا احساس بھی ختم ہوجائے۔

آج الکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا کے ذریعہ عالمی ماحول کو کرپٹ (Corrupt) کرنے کی کوشش ہورہی ہے اور اس کا سب سے بڑا نشانہ مسلمان ہیں، دین کے دشمنوں کا نشانہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہر محاذ سے ایسا کرپٹ کردیا جائے کہ وہ پوری طرح کھوکھلے ہوکر رہ جائیں اور پھر ان میں کسی مقاومت کی استطاعت بھی باقی نہ رہے، اس خطرناک سازش سے مقابلہ کا بڑا ہتھیار یہ دعوت ہے، اس کی بیداری پیدا ہوجائے تو مسلمانوں کو کوئی بھی لقمۂ تر نہیں بنا سکتا۔

منکرات کے سیلاب پر بھلائیوں کا جو باندھ باندھا گیا تھا اس میں جگہ جگہ سوراخ کردیئے گئے ہیں، مسلمانوں کا لقب ''خیر امت'' ہے، ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان منافذ کو بند کرنے کی کوشش کریں ورنہ اس کا خطرہ ہے کہ کہیں پوری انسانیت منکرات کے اس سیلاب کی نذر نہ ہوجائے اور پھر اس کے بعد سنبھالنا مشکل ہو۔

مکی اور مدنی زندگی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

سیرت نبوی ﷺ سے زندگی کے ہر میدان میں رہنمائی حاصل ہوتی ہے، بعثت نبوی ﷺ کے بعد آنحضور ﷺ کی زندگی مکی اور مدنی دور میں منقسم ہے، اور ان دونوں دوروں میں ہر دور کے لیے ہدایت کا سامان ہے۔

مکی دور سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں مسلمانوں کی پہلی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ اپنے ایمان کو مضبوط کریں اور لوگوں کے سامنے دین پیش کریں، اور اس سلسلہ میں جو بھی پریشانی ہو اس کو برداشت کریں، کیونکہ ان کا یہ تکلیف برداشت کرنا اللہ کے لیے ہوگا، جس پر ان کو اللہ کی طرف سے اجر ملے گا، اس کے ساتھ ساتھ ان کو اصل فکر لوگوں تک دین اسلام پہنچانے کی ہو، اور وہ لوگوں کو یہ حقیقت سمجھا دیں کہ اگر وہ اس دین کو مانتے ہیں تو وہ اللہ کے نیک بندے بن سکتے ہیں اور آخرت میں کامیاب ہوسکتے ہیں، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ان کی نسبت صحیح معنی میں جڑ سکتی ہے، جس کا ان کو دعوی بھی ہے، پھر ان کو وہ سارے حقوق حاصل ہوجائیں گے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایمان والوں کو دیئے جاتے ہیں، اور اگر وہ صحیح بات کو سمجھنے کے بعد بھی نہیں مانتے ہیں، بلکہ ضد پر اتر آتے ہیں تو وہ یہ حقیقت بھی سمجھ لیں کہ ان کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔

سیرت نبوی ﷺ سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ ہجرت کے بعد اہل اسلام کے طرز زندگی میں فرق واقع ہوا اور اسلام کو غیر معمولی فتح نصیب ہوئی، مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا، اور مدینہ منورہ جو اب تک یثرب کے نام سے مشہور تھا، وہ اسلام کا مرکز بن گیا، لہٰذا مدنی زندگی میں اس بات کے مواقع زیادہ ہوگئے تھے کہ یہاں سے بیٹھ کر اسلام کی دعوت لوگوں تک پہنچائی جائے، اور دین کی تشریح کی جائے، اور اگر کوئی دشمن طاقت کی بنیاد پر حملہ کرے تو اس طاقت کا جواب بھی دیا جائے، اسی لیے مدنی دور میں اس بات کی بھی اجازت دے دی گئی کہ اب مسلمانوں کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی حفاظت اور اپنے دین کی تقویت کے لیے طاقت کا استعمال کریں۔

گویا مدینہ کی زندگی میں دو پہلو سامنے آئے، ایک یہ کہ اسلام کے پیغام کو عام کرنا ہے، اور دوسرے یہ کہ اگر کوئی اس راہ میں رکاوٹ ڈالتا ہے تو طاقت کے استعمال کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرنا ہے، یعنی جو فرد یا قبیلہ یا شہر اور ملک دشمنی کرے گا، اور مسلمانوں پر حملہ کرے گا یا مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا، تو اس کو طاقت کے ساتھ روکا جائے گا، اور اس کا بھرپور جواب بھی دیا جائے گا، یہی وجہ ہے کہ اس کے نتیجہ میں مختلف جنگیں پیش آئیں، اور غزوۂ بدر سے لے کر غزوۂ تبوک تک یہ سلسلہ چلا، سن دو ہجری میں غزوۂ بدر پیش آیا، اس وقت مسلمان بہت کمزور تھے، وہ بدر کے مقام پر لڑنے کے ارادہ سے نہیں گئے تھے، بلکہ اس قافلہ کو روکنے کے لیے گئے تھے جو قریش کا قافلہ ملک شام سے سامان تجارت لے کر آرہا تھا، اس کے واسطہ تھوڑی جمعیت بھی کافی تھی، کسی بڑی تیاری کی ضرورت نہ تھی، اس لیے تھوڑی تیاری کے ساتھ آپ ﷺ بدر تشریف لے گئے، لیکن بعد میں آپ ﷺ کو راستہ ہی میں بذریعہ وحی یہ معلوم ہوا کہ باقاعدہ مکہ سے کفار کی فوج مسلمانوں کے مقابلہ میں لڑنے آرہی ہے، لہٰذا ایسی صورت میں دو ہی باتیں اختیار کی جاسکتی تھیں؛ ایک تو یہ کہ ان کو راستہ ہی میں روک کر ان سے مقابلہ کیا جائے، دوسرے یہ کہ آپ ﷺ مدینہ واپس آجائیں، لیکن اس سے احساس کمتری پیدا ہونے کا خطرہ تھا، اور یہ بھی امکان تھا کہ کہیں وہ لوگ مدینہ پہنچ کر حملہ نہ کردیں، اس لیے مناسب یہی معلوم ہوا کہ مقابلہ کیا جائے، یہی مشیت خداوندی بھی تھی کہ مقابلہ ہی ہوجائے تاکہ دشمنان اسلام کو اسلام کی قوت کا اندازہ ہوسکے۔

لیکن جنگ کرنے کا مکمل ارادہ کرنے کے باوجود بھی نبی رحمت ﷺ نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا کہ ان کی جنگ کے متعلق کیا رائے ہے؟ کیونکہ آپ ﷺ اپنے ساتھیوں پر جبر کرنا نہیں چاہتے تھے، لہٰذا جب آپ ﷺ کو سب کی طرف سے جواب مل گیا اور یہ اندازہ ہوگیا کہ وہ سب جنگ کے لیے تیار ہیں، اور جو حکم خدا و رسول ہوگا، آپ کے جانثار صحابہ وہی کریں گے، اور اس سلسلہ میں وہ اپنی جان کی ذرا بھی پرواہ نہیں کریں گے، تب آپ ﷺ نے دشمنوں سے مقابلہ کا فیصلہ کیا، اس جنگ میں مسلمانوں کی

ظاہری تیاری مکمل ہونے کے ساتھ نصرت الٰہی بھی مکمل طور پر شامل حال رہی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کفار شکست کھا کر بھاگے، یہی وہ پہلی جنگ تھی جو گویا اسلام کی فتح کا آغاز تھی، اس سے مسلمانوں کی ہمتیں بڑھیں اور ان کے حوصلے بھی بلند ہوئے، اور کافروں کو بھی یہ اندازہ ہوگیا کہ اب ہم مسلمانوں کو اتنی آسانی سے فنا نہیں کرسکتے، اور یہ بھی بخوبی اندازہ ہوگیا کہ وہ مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کرتے تھے، اب مدینہ میں رہتے ہوئے وہ سلوک کرنا ناممکن ہے۔

اسی لیے بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ اب ہم کو اپنی پالیسی بدل لینا چاہیے اور محمد ﷺ کے دین ہی کی اتباع کرلینی چاہیے، ورنہ جنگوں کا یہ سلسلہ جاری رہے گا، لیکن خاندانی نخوت اور دیگر مادی محبتوں کے سبب ایسا نہ ہوسکا، اور جنگوں کا سلسلہ قائم رہا، البتہ مسلمانوں کو ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے رہنمائی اور ہدایات ملتی رہیں، جن سے انہیں خوب فائدہ ہوا اور پھر ایک قریبی عرصہ میں وہ دن بھی آیا کہ جس مکہ سے انتہائی کسمپرسی کے حالات سے ہجرت کی تھی، اسی مکہ میں فاتحانہ شان کے ساتھ داخلہ ہوا۔

مدنی دور جو کہ دس سال پر مشتمل ہے، گرچہ اس دور میں خاصا وقت جنگی مہموں میں صرف ہوا، لیکن یہی وہ عرصہ ہے جس میں خاص طور پر زندگی کے گذارنے کے وہ تمام راہنما اصول فراہم کردیے گئے، جن کی انسانی زندگی میں تا قیامت ضرورت پیش آسکتی ہے، لہٰذا مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے آباد ہونے کے بعد ایک صالح انسانی معاشرہ وجود میں آیا، اور لوگ اسلام سے مانوس ہوئے، اور اسلام کی جڑیں لوگوں کے سینوں میں پیوست ہوگئیں، بے شمار دانش جویان حق اسلام قبول کرنے پر مجبور ہوئے۔

اسی طرح مدینہ منورہ میں جو یہود آباد تھے، ان سے آپسی معاہدات ہوئے، تاکہ زندگی میں امن وامان قائم رہ سکے، اور جب ان معاہدات کی پامالی ہوئی تو سخت کارروائی بھی کی گئی، لیکن ان کے علاوہ بھی کچھ ایسے لوگ تھے جن کے دلوں پر اسلام کی اشاعت سے آرا چلتا تھا، وہ کسی بھی صورت یہ گوارہ نہیں کررہے تھے کہ اسلامی معاشرہ ترقی کرے، لہٰذا انہوں نے اپنی پالیسی اس طرح بدلی کہ بظاہر مسلمانوں کے زمرہ میں شامل ہوگئے، مگر بباطن اسلام سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا، قرآن مجید میں ان لوگوں کو ''منافق'' کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے، ان کا کام یہ تھا کہ یہ اسلام کی کسی خوبصورت بات میں شک پیدا کرنے کی کوششیں کرتے رہتے تھے، اور معمولی سے معمولی باتوں پر بھی تنقید میں کوئی کسر نہ چھوڑتے تھے، ان کی مکاریوں سے مسلم معاشرہ کو بہت نقصان پہنچا، قرآن میں منافقین کے اس شیوہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اہل ایمان کو حکم دیا گیا کہ کہیں وہ بھی ایمان کے سلسلہ میں تردد کا شکار نہ ہوجائیں، ان کو چاہیے کہ اللہ پر ایمان مضبوط رکھیں، جس وقت بھی اللہ اور اس کے رسول کا جو حکم ہو، اس کی تعمیل میں ادنی درجہ کا تامل بھی نہ برتیں، کیونکہ اگر ذرا بھی تردد ہوا تو ایمان خطرہ میں پڑ جائے گا اور پھر بدترین انجام ہوگا۔

قرآن مجید کی ان صریح ہدایات کے بعد تمام اہل ایمان اس قدر چوکنا ہوگئے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ایک ایک بات پر ہمہ وقت کان دھرے رہتے تھے، جو بات بھی آپ ﷺ ارشاد فرماتے صحابہ کرام فوراً اس کی تعمیل کرتے، اور بسا اوقات فرط محبت اور جذبہ عمل کی بنیاد پر وہ یہ بھی نہ دیکھتے کہ آپ ﷺ کا یہ قول کسی کے ساتھ مختص ہے یا ایک عام بات ہے، بلکہ یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا تھا کہ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے کوئی بات پہلے صادر ہوئی یا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے عمل پہلے ہوا۔

ایک مرتبہ کسی مصلحت کے پیش نظر آپ ﷺ نے کسی علاقہ میں مسلمانوں کی ایک فوج بھیجنے کا ارادہ کیا، جس میں جانے کے لیے تمام صحابہ تیار ہوگئے، اس پر یہ حکم نازل ہوا کہ وہاں سب کا جانا ضروری نہیں، بلکہ چند آدمیوں کا جانا ہی کافی ہے، اس لیے کہ اگر تمام لوگ وہیں چلے گئے تو زندگی کی دوسری ضروریات کو کون پورا کرے گا، ضرورت اس بات کی ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں جو دین کو سیکھیں، اور صحبت نبوی میں رہ کر تعلیمات دین حاصل کریں، تاکہ خود بھی عمل کرسکیں اور اپنے دوسرے مسلمانوں کو جو یہاں حاضر نہیں ہیں، ان تک بھی وہ تعلیمات پہنچادیں، گویا جس طرح میدان جنگ میں جانا ضروری ہے، تاکہ وہاں دشمن پر فتح حاصل کی جاسکے، اسی طرح دین کی تعلیم حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ سیرت کے اس اجمالی جائزہ سے معلوم ہوا کہ ہر جگہ کے حالات الگ ہوتے ہیں، جن کو پیش نظر رکھ کر ہی دعوت کا کام کرنا چاہیے، اسی طرح ہر موقع کی نزاکتوں کو سمجھنا بھی دعوت کے کام میں بے حد ضروری ہے۔

دو خطرے - خارجی اور داخلی

(بقلم:- حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی)

ترجمانی: محمد امین حسنی ندوی

اس وقت اسلام دو خطرات سے دوچار ہے اور شائد ہمیشہ رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا، ایک خطرہ خارجی اور دوسرا خطرہ داخلی، خارجی خطرہ خارجی عناصر سے ہے جو امریکا و یورپ میں بستے ہیں اور وہاں بیٹھ کر اپنے قلم کے ذریعہ قرآن وحدیث کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرتے ہیں، اور قرآن کریم، سیرت نبوی ﷺ اور آثار صحابہ کی ایسی غلط اور بے بنیاد تشریحات کرتے ہیں جو ان ذہنوں کو مسموم کرتی ہیں جو ذہن آنکھ بند کرکے ان تشریحات پر اعتماد کرتے ہیں۔

یہ افکار ونظریات مغربی سامراج کے دور میں زیادہ عام ہوئے جس نے ایک نیا نظام تعلیم وتربیت دنیا کو دیا، اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک ایسی جماعت مسلمانوں کی ان تعلیمی مراکز سے نکلی جو ان کتابوں کی روشنی میں ان افکار کی پروردہ بنی جن کا عقیدہ سلف کے عقیدہ سے الگ ہی نہیں سلف کے عقیدہ کے بالکل خلاف رہا، ان کی تہذیب، ان کی معاشرت، ان کے معاملات، ان کے اخلاق، ان کا طریقہ کار، ان کے افکار وخیالات سب ہی اسلاف سے جداگانہ اور ان کے طریقہ سے ہٹ کر رہے، وہ اخلاق ان میں ندارد رہے جن اخلاق نے دلوں کو فتح کیا، اور جن کا اعتراف خود بعض انصاف پسند مغربی مفکرین نے کیا۔

ایک مشہور مستشرق قلمکار ارنالڈ نے اپنی کتاب ''الدعوۃ الی الاسلام'' میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے اور دلائل سے یہ بات ثابت کی ہے کہ اسلام دنیا میں اخلاقی برتاؤ اور اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے والے مسلمانوں کے اخلاق سے پھیلا ہے اور بہت سے ملک اسلامی مملکت کا حصہ بن گئے اور اسلامی ممالک میں شامل ہوگئے جو اسلامی مبلغین وداعیوں سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکے اور ان کی تعداد ان مفتوحہ ملکوں سے کہیں زیادہ ہے جو جنگ سے فتح کیے گئے، اس کا اثر یہ ہوا کہ وہاں کے رہنے والوں کی زبان بھی بدل گئی۔

اس کا اعتراف اسلام دشمن عناصر نے بھی کیا کہ اسلام اپنے اندر ایک ایسی تاثیر اور اثر انگیزی رکھتا ہے جو دوسرے مذاہب میں نہیں پائی جاتی ہے، اور اس بات کی دلیل یہ ہے کہ مسلمانوں کی تعداد غیر مسلم ممالک میں دن بدن بڑھتی جارہی ہے اور مسلم اقلیت ملکی سطح پر اکثریت میں تبدیل ہورہی ہے جیسا کہ مردم شماری سے معلوم ہوتا ہے اور خاص کر مغربی ممالک میں اور اس کی ایک دلیل مساجد، مدارس اور اسلامی تعلیمی مراکز کا ان ملکوں میں قیام ہے۔

اسی وجہ سے اسلام کی کشش کو ختم کرنے اور اس کو غیر مؤثر بنانے کی کوششیں بھی تیز ہوچکی ہیں، حکومتی پیمانہ پر بھی سازشوں کا سلسلہ جاری ہے، شریعت کو ناممکن العمل باور کرانے کے لیے ہر ممکن قدم اٹھایا جارہا ہے، اسلام کو قدامت پرستی کے رمز کے طور پر متعارف کرایا جارہا ہے۔

عالم اسلام سے ہزاروں میل کی دوری پر واقع ہندوستان میں علماء نے اسلامی حکومت کے زوال کے بعد طے کیا کہ وہ مسلم پرسنل لاء کی حفاظت کریں گے، ملک میں اسلامی تربیتی مراکز قائم کریں گے، اور نوجوان نسل کو دین سے جوڑنے کی کوشش کرتے رہیں گے، چنانچہ ہندوستان میں دینی تعلیمی مدارس قائم کیے گئے، اور علماء ہر اس آواز کے خلاف سینہ سپر ہوگئے جن سے براہ راست دینی احکام اور اسلامی تعلیمات پر زد پڑی ہو۔

مسلمانوں کے دور حکومت میں جب مسلم حکمراں اسلامی تعلیمات سے بھٹک گئے تو علماء اس انحراف کے خلاف سد سکندری بن گئے اور ہر طرح سے جانی ومالی قربانیاں پیش کیں حتی کہ نظام اپنے صحیح اسلامی نہج پر قائم ہوگیا اور جس نے بھی ہندوستانی تاریخ کا مطالعہ کیا

ہے اسے بخوبی معلوم ہے کہ اسلامی حکومت اور سامراجی نظام کے دوران جہاں علماء کرام نے اسلامی عقیدہ اور اسلامی تعلیمات کا تحفظ کیا وہیں انہوں نے بیش بہا علمی خدمات کا نمونہ پیش کیا اسلامی علمی کتب خانوں کو مالا مال کیا نیز ان انحرافات، بدعات وخرافات کا صفایا کیا جو انفرادی واجتماعی زندگی میں جڑ پکڑ چکے تھے جہالت کو مٹا کر تعلیم وتعلم کو فروغ بخشا اور یہ ان علماء ومصلحین کی دینی وعلمی کاوشوں ہی کا نتیجہ تھا کہ دین دشمنوں کی تمام تر ناپاک سازشوں کے باوجود آج بھی ہر قسم کی تحریف سے پاک ہے۔

یہ وہ خارجی خطرہ ہے جس کا سامنا ہر زمانہ میں علماء ومصلحین نے کیا یہاں تک کہ مظلومیت ومغلوبیت اور سخت آزمائشوں کے دور میں بھی کیا اور برابر کرتے رہے ہیں۔

دوسرا خطرہ جس کا اسلام کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے وہ داخلی ہے جس کی پہلی وجہ مغرب زدہ وہ حضرات ہیں جو بہ آسانی دانستہ یا غیر دانستہ اسلام مخالف عناصر کے جھانسہ میں آکے ان کا آلۂ کار بن جاتے ہیں اور پوری امت کی پریشانی کا سبب بنتے ہیں۔

دوسری وجہ مسلمانوں کا آپسی اختلاف وانتشار ہے ان کا شیرازہ بکھر چکا ہے جبکہ وہ ایک امت ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿كَأَنَّهُم بُنيَانٌ مَّرْصُوصٌ﴾ (الصف ٤/) ﴿وَإِنَّ هَـٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ﴾ (المومنون/ ٥٢) ﴿إِنَّ هَـٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ (الانبیاء/ ٩٢)﴾

آپ ﷺ کا ارشاد ہے! (مثل المومنین فی توادھم وتراحمھم وتعاطفھم کمثل الجسد الواحد اذا اشتکی منه عضو تداعی له سائر الجسد بالسھر والحمی (متفق علیہ) المومن للمومن کالبنیان یشد بعضه بعضا (بخاری)

یہ وہ انتہائی دشوار کن اور سخت ترین حالات ہیں جس میں مسلمان زندگی گذار رہے ہیں اور جو پوری امت سے اس بات کے متقاضی ہیں کہ وہ اسلام دشمن طاقتوں کے مکر اور ان کے چالوں سے واقف رہیں اور اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں آپس میں نزدیک آنے کی راہیں تلاش کریں اور امت کو فرقہ پرستی کے مہیب سایہ سے نکالیں اتحاد واتفاق کا سرتاپا پیکر بن جائیں اور ہر اس چیز سے دور رہیں جو ان کی صفوں کو پارہ پارہ کرے۔

جیسا کہ مسلمانوں نے خارجی خطرہ کا سامنا کیا ویسے ہی ضروری ہے کہ وہ داخلی خطرہ کا بھی سامنا کریں اس بابت اولین ذمہ داری مسلمان قائدین کی ہے کہ وہ بذات خود اپنے اختلافات کم کریں ،دل اپنے صاف کریں ،فروعی مسائل میں اپنے اندر لچک پیدا کریں، برداشت کرنے کی عادت ڈالیں ،صبر کا مزاج بنائیں، فرقہ بندی کی آگ میں جھلس رہے مسلمانوں کو اس آگ سے نجات دلائیں اور دوسری ذمہ داری مسلمانوں کی ہے کہ وہ اپنا فیصلہ خود کریں دشمنوں کو اپنے ذاتی معاملات میں مداخلت کا موقع نہ دیں۔

اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کا جو سلسلہ چل پڑا ہے اس کے مقابلہ کے لیے ایسے قلمکاروں کی بھی شدید ضرورت ہے جو اسلام کی سچی اور حقیقت پر مبنی تصویر دنیا کے سامنے لائیں۔

ان باتوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمان تعلیم کو فروغ دیں، جہالت کو دور کریں۔

صحیح شعور کا فقدان

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

”کسی قوم کے لیے سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ وہ صحیح شعور سے خالی ہو، ایک ایسی قوم جو ہر طرح کی صلاحیتوں اور دینی ودنیوی دولتوں سے مالا مال ہو، لیکن اس میں نیک وبد کی تمیز نہ ہو، وہ اپنے دوست ودشمن کو پہچانتی نہ ہو، پچھلے تجربوں سے فائدہ اٹھانے کی اس میں صلاحیت نہ ہو، اپنے رہنماؤں کا احتساب کرنے اور قومی مجرموں کو سزا دینے کی اس میں جرأت نہ ہو، جو خود غرض قائدین کی شیریں کلامی پر ہر مرتبہ دھوکہ کھانے کے لیے تیار ہو تو وہ اپنی تمامتر دینی ودنیوی سرفرازیوں کے باوجود کبھی کامیاب نہ ہوگی۔

اس وقت ملت کی ایک بڑی خدمت یہ ہے کہ مسلمانوں میں صحیح شعور پیدا کیا جائے، ایسا شعور جس سے وہ اپنے تمدنی، سیاسی، اجتماعی اور دینی مسائل ومعاملات میں ایک عاقل وبالغ انسان کی طرح غور کر سکے، اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت اس میں پیدا ہو جائے۔“

عقل مندی کا تقاضا

مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ

موجودہ دور بہت عجیب وغریب دور ہے، اس دور میں عقل کا خوب چرچا ہے مگر بے عقلی کی باتیں زیادہ ہیں، اس زمانہ میں لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ ہر شخص عقل مند ہے، یہاں تک کہ اس دور کے بچے بھی ایسی باتیں کرتے ہیں اور ایسے سوالات کرتے ہیں جن سے خود بڑے پریشان ہیں کہ ایک چھوٹا بچہ یہ باتیں کیسے پوچھ رہا ہے؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس دور کے بڑے اتنی بے عقلی کر رہے ہیں، معلوم ہوتا ہے ان کو جو عقل بچپن میں ملی تھی وہ بھی کھو چکے ہیں، اس ناحیہ سے دیکھا جائے تو یہ دور واقعی بہت عجیب وغریب دور ہے، ایک طرف ظاہر میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، لیکن پڑھے لکھے ہوکر جہالت میں مبتلا تعداد بھی اتنی ہی ہے، جس کو یہ کہا جاسکتا ہے کہ عقل مندی میں حماقت ہے اور پڑھے لکھے ہوکر جاہل ہیں، اور یہ کام بڑا نازک ہے کہ عقل مند اور پڑھے لکھے شخص کی جہالت کو دور کیا جائے، تاریخ میں ایسے بہت سے بادشاہ گذرے ہیں جن کے متعلق تاریخ نویسوں نے لکھا ہے: "العاقل المجنون" یعنی وہ عقل مندی کی باتیں کرتے تھے مگر بعض اوقات ایسے کام کرتے تھے، جن سے ان کا پاگل ہونا ظاہر ہوتا تھا، اسی طرح اس زمانہ میں بھی ایسے بہت سے لوگ ہیں جو اپنی ذاتی زندگی کی بات کرتے ہوئے عقل مند نظر آتے ہیں، لیکن جب وہی لوگ انسانی سطح پر سماج میں بات کرتے ہیں تو بالکل بے عقل معلوم ہوتے ہیں۔

عقل کا صحیح استعمال بہت ضروری ہے، اس کا حق یہ ہے کہ اس کو بند کرکے نہ رکھا جائے اور غلط استعمال نہ کیا جائے، ورنہ آج کل ایسا ماحول بنایا جارہا ہے کہ آپ عقل کا صحیح استعمال نہ کرسکیں، گویا اس وقت پوری دنیا میں یہ (Brain Washing) برین واشنگ ہورہی ہے کہ عقل کو ایسا بنادو کہ سوچنے کی صلاحیت ہی نہ رہ جائے، اس لیے ہم میں سے ہر ایک کو بہت ہوشیار رہنا چاہیے، اور ہر جگہ اپنی عقل کو صحیح طور پر استعمال کرنا چاہیے، کیونکہ اگر کوئی چیز استعمال نہیں کی جاتی تو اس کا نفع ختم ہوجاتا ہے، لیکن عقل کے استعمال میں یہ خیال ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ وہ استعمال برمحل ہو، ورنہ بسا اوقات غیر محل پر عقل استعمال کرنے کا نتیجہ بھی بڑا سنگین ہوتا ہے۔

موجودہ دور میں بے عقل باتوں کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہا جائے کہ کوا کان لے گیا اور تمام لوگ اس کوے کے پیچھے پڑ جائیں، اور اپنے کان پر ہاتھ پھیر کر نہ دیکھیں، تاکہ پتہ چل سکے کہ کان ہے یا واقعۃً کوا لے گیا، ٹھیک یہی صورت حال آج ہمارے معاشرہ کی ہوگئی ہے، نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اگر اخبار میں کوئی بے بنیاد خبر اچھے قالب میں چھپ جائے تو تمام لوگ اسی پر اعتماد کرلیتے ہیں، اور حقیقت سے باخبر ہونے کی فکر نہیں کرتے ہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مواقع کے لیے عقل کی نعمت عطا کی ہے، تاکہ آدمی اپنی عقل استعمال کرکے صورت حال کا صحیح اندازہ لگاسکے۔

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ انسانی سماج میں تعلیم کا جذبہ ہونا بہت ضروری چیز ہے، واقعہ یہ ہے کہ تعلیم ایک نور ہے جس سے معاشرہ میں روشنی پھیلتی ہے، اگر کوئی شخص اس حقیقت کا انکار کرتا ہے تو ظاہر ہے وہ بے عقلی کا ثبوت دیتا ہے، لیکن اس تعلیم کے لیے یہ شرط ہے کہ اس کے اوپر غلاف نہ چڑھایا جائے، یعنی اس کی روشنی کو بند کرکے عام نہ کیا جائے، بلکہ اس کی روشنی کو کھلا رکھا جائے، موجودہ دور میں تعلیم کا دور دورہ ہونے کے باوجود بھی تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے بے عقلی کی باتیں سامنے آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی تعلیم پر ایک غلاف چڑھا ہے، جس کی وجہ سے تعلیم کی روشنی سماج میں نظر نہیں آرہی ہے اور لوگ تاریکی کی طرف بڑھتے جارہے ہیں، اور بسا اوقات اس سلسلہ میں ایسے نمونے سامنے آتے ہیں، جن کو دیکھ کر ایک جاہل بھی پناہ مانگے، بطور مثال ڈاکٹری شعبہ کو لے لیا جائے جو کہ انسانیت کی خدمت کا بہت اچھا طریقہ ہے، لیکن آج

اس شعبہ کی عمومی صورت حال ایسی ہوگئی ہے جس کا انسانیت سے کوئی تعلق نہیں ہے، کتنے ایسے سنگ دل ڈاکٹر ہیں جو پریشان حال مریضوں کے گردے ٹھیک کرنے کے بجائے نکال ہی لیتے ہیں، اس سے یہ بات پتہ چلتی ہے کہ گرچہ اس زمانہ میں لوگ پڑھ لکھ گئے ہیں اور یہ زمانہ ترقی کا ہے، لیکن یہ پڑھائی لکھائی اور ترقی درحقیقت جاہلیت کے غلاف میں ہے، اور ظاہر ہے جب پڑھا لکھا آدمی بگڑنے پر آتا ہے تو وہ شیطان کے بھی کان کاٹتا ہے۔

اس لیے تعلیم کے میدان میں انسانیت کی خدمت پیش نظر رکھنا چاہیے، اور یہ سمجھنا چاہیے کہ ہماری پڑھائی لکھائی کا مقصد صرف حصول زر نہیں ہے، اگر صرف دولت کمانا ہی مقصد ہوتا تو بغیر پڑھے لکھے بھی اس مقصد میں کامیابی ممکن تھی، لیکن ہماری تعلیم کا مقصد دراصل انسانیت کی بے لوث خدمت ہے اور دوسروں کی راحت وسکون ہے، واقعہ یہ ہے کہ اگر ہماری ذہنیت ایسی بن جائے تو تڑپتی انسانیت کو سکون نصیب ہوجائے، آج ہر شخص پریشان ہے، اور ہر شخص کو یہ شکوہ ہے کہ ڈاکٹروں کی نگاہ لوگوں کی جیب پر ہوتی ہے، ان کو خدمت خلق سے کوئی مطلب نہیں ہوتا ہے، ان کا مقصود علاج کرنا نہیں، بلکہ دولت بٹورنا ہے، اور اسی طرح جو لوگ سرکاری آفسوں میں بیٹھے ہوئے ہیں، وہاں پر لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ یہاں کے افسران اصلاً لوگوں کا کام کرنے کے لیے نہیں بیٹھے ہیں، بلکہ لوگوں کی بھاری بھاری رقمیں ہڑپنے کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں اور ان افسران کی نظر لوگوں کی پریشانیوں پر نہیں ہوتی ہے، بلکہ ان کی نگاہ ان کی جیب پر ٹکی رہتی ہے۔

اگر دنیا کا عمومی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ واقعی آج پڑھنا لکھنا بہت ہوگیا ہے، اور اس وقت اتنے کالج ہیں کہ شاید دنیا کی تاریخ میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اس وقت تک اتنے کالج نہ ہوئے ہوں، لیکن اس کے باوجود اس زمانہ میں انسانیت کے خلاف اتنا کام ہورہا ہے اور اتنی جہالت پھیل رہی ہے، جو شاید حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اس وقت تک اتنی نہ پھیلی ہو، بس فرق اتنا ہے کہ اب جہالت پڑھی لکھی ہے، پہلے جہالت خالص جہالت تھی، لیکن اب up-to-date جہالت ہے، ظاہر میں عمدہ لباس ہے اور پڑھا لکھا آدمی ہے لیکن اندر سے ڈاکو ہے، یا یوں کہہ لیں کہ اندر سے چیتا یا سانپ ہے۔

تعلیمی میدان میں ایک بات یہ بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ ہم جو تعلیم نئی نسل کو دے رہے ہیں، اس کی تاثیر کیا ہے؟ اس دور کا یہ بھی ایک المیہ ہے کہ آج کالجوں میں جو تعلیم دی جارہی ہے، اور جو باتیں سکھائی جارہی ہیں، وہ تعلیم نہیں بلکہ درحقیقت ایک زہر ہے، جس سے پوری انسانیت زہر آلود ہوتی جارہی ہے۔

عقل مندی کا ایک دوسرا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے معاشرہ کی اصلاح کی فکر کریں، آج سماج میں ایسی بے شمار خواتین ہیں جن کو جلایا جارہا ہے، اسی طرح نہ جانے کتنے ایسے بوڑھے ماں باپ ہیں جن کو انہیں کے گھروں سے دھکے دے کر نکالا جارہا ہے، اگر غور کیا جائے تو اس گندے ماحول کی بھی بنیادی وجہ یہی ہے کہ تعلیم کے پھل کڑوے نکل رہے ہیں، اور عقل کو اس کے غیر محل پر استعمال کیا جارہا ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مغربی تہذیب حد درجہ محبوب ہوگئی ہے، آج حال یہ ہوگیا ہے کہ لوگ مغربی تہذیب پر ایسا نچھاور ہیں کہ اپنے ملک کی تہذیب کو فراموش کرنے پر راضی ہیں، جب کہ خود مغربی اقوام کا حال یہ ہے کہ وہ خود اپنی تہذیب سے پریشان ہیں۔

اس وقت پوری دنیا حقیقی امن وسکون کی تلاش میں ہے، ہر کسی کی خواہش ہے کہ وہ خوشی کی زندگی بسر کرے، لیکن افسوس کی بات ہے کہ آج انسان کے دل کی خوشی ختم ہوگئی ہے، اور یہ طے ہے کہ جب تک دل خوش نہیں ہوگا، اس وقت تک کسی بھی چیز میں مزا حاصل نہیں ہوسکتا، اسی لیے کتنے ایسے لوگ ہیں جن کے پاس پیسے کی بے انتہا دولت ہے، مگر ان کو حقیقی سکون میسر نہیں ہے، جب کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ کسی بھی طرح ان کو سکون نصیب ہوجائے، لہٰذا ایسے حالات میں دانشور طبقہ کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ تعلیمی میدان میں اصلاح کی کوشش کرے، انسانیت کی خدمت کے جذبہ کو فروغ دے اور دنیا کو حقیقی امن وسکون سے آشنا کرائے، جب لوگوں یہ حقیقی سکون نصیب ہوگا تو معاشرہ سے وہ تمام متعفن چیزیں خود بخود دور ہوجائیں گی، جن سے آج ہر انسان کڑھن محسوس کررہا ہے۔

گذشتہ سے پیوستہ

توحید کیا ہے؟

بلال عبدالحی حسنی ندوی

نجوم پرستی کی نفی:

"عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ الْجُهَنِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةَ الصُّبْحِ بِالْحُدَيْبِيَةِ فِيْ إِثْرِ سَمَاءٍ كَانَتْ مِنَ اللَّيْلِ، فَلَمَّا انْصَرَفَ أَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ فَقَالَ: هَلْ تَدْرُوْنَ مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ؟ قَالُوْا: اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ أَعْلَمُ، قَالَ: قَالَ؛ أَصْبَحَ مِنْ عِبَادِيْ مُؤْمِنٌ بِيْ وَ كَافِرٌ، فَأَمَّا مَنْ قَالَ: مُطِرْنَا بِفَضْلِ اللّٰهِ فَذٰلِكَ مُؤْمِنٌ بِيْ كَافِرٌ بِالْكَوْكَبِ، وَأَمَّا مَنْ قَالَ: مُطِرْنَا بِنَوْءِ كَذَا وَ كَذَا، فَذٰلِكَ كَافِرٌ بِيْ مُؤْمِنٌ بِالْكَوْكَبِ." (صحیح مسلم: ۲۳۱)

حضرت زید بن خالد جہنیؓ سے روایت ہے فرمایا: ایک رات حدیبیہ میں پانی برسا، صبح کو حضور ﷺ نے نماز پڑھائی، جب نماز سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے ہم سب کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا: تم جانتے ہو کہ تمہارے رب نے کیا فرمایا: لوگوں نے فرمایا: اللہ اور اس کے رسول خوب جانتے ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ نے فرمایا کہ آج صبح کے وقت میرے بعض بندے میری قدرت کے قائل ہوئے اور بعض منکر، جنہوں نے کہا: یہ بارش اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہوئی، تو یہ میرے مومن بندے ہیں، ستاروں کے منکر ہیں، جنہوں نے کہا کہ پچھتر کے سبب سے ہوئی تو وہ میرے منکر ہیں، اور ستاروں کے معتقد ہیں۔ (صحیح مسلم: ۲۳۱)

اس حدیث میں آپ ﷺ نے زمانہ جاہلیت کے ایک عقیدہ کی نفی فرمائی ہے، مقام حدیبیہ میں صبح کی نماز کا وقت تھا اور رات کو بارش ہوئی تھی، اس کے بعد یہ قصہ ہوا کہ آپ ﷺ جب نماز سے فارغ ہوئے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا کہ کیا تم جانتے ہو تمہارے رب نے کیا کہا؟ صحابہ نے عرض کیا: اللہ اور رسول زیادہ جانتے ہیں، یہاں پر آپ ﷺ نے ایک اہم بات بتانے سے پہلے سوال کا انداز اختیار فرمایا ہے، جب کہ بات پہنچانے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ سیدھے سیدھے بات کو بتادیتے، لیکن ایک مؤثر طریقہ یہ بھی ہے کہ پہلے سوال کرکے ذہن میں تجسس وطلب پیدا کی جائے، اور اس کے قبول کرنے کی بہتر سے بہتر طریقہ پر صلاحیت پیدا کی جائے اور اس کے بعد بات بتائی جائے، آپ ﷺ کا یہی طریقہ تھا، مذکوہ حدیث میں بھی آپ ﷺ نے یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے، اور صحابہ کے پوری طرح متوجہ ہونے کے بعد فرمایا کہ اللہ فرماتا ہے؛ میرے کچھ بندے مجھ پر ایمان رکھنے والے ہیں اور کچھ کافر ہیں، لہٰذا جو بندے یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے فضل سے بارش ہوئی ہے تو وہ مجھے ماننے والے ہیں اور ستاروں وکواکب پر ایمان نہیں رکھتے ہیں، گویا ان کا انکار کرتے ہیں، اور جو بندے یہ کہتے ہیں کہ فلاں فلاں پچھتر کی وجہ سے اور فلاں ستارے کے فلاں مدار میں پہنچنے کی وجہ سے بارش ہوئی ہے، گویا وہ ستاروں کو مانتے ہیں اور ہمیں نہیں مانتے۔

طریقۂ تبلیغ:

آپ ﷺ کے بات پہنچانے کا جو طریقہ رہا ہے، اس میں آپ ﷺ نے بڑی حکمتیں اختیار فرمائی ہیں، بات پہنچانے کا ایک طریقہ یہ ہوسکتا تھا کہ کسی مناسبت سے اور کسی موقع پر آپ یہ کہہ دیتے کہ ایسا کام نہیں کرنا چاہیے، لیکن بجائے اس کے آپ ﷺ نے ایک مرتبہ مقام حدیبیہ میں جب کہ بارش ہوئی اور اس کے بعد بارش کھل گئی، اس وقت آپ ﷺ نے سب کو مخاطب کرکے یہ بات ارشاد فرمائی کہ ایسے بہت سے لوگ ہیں جو ستاروں پر عقیدہ رکھتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ فلاں فلاں پچھتر کی وجہ سے ہمیں بارش ملی، اور جب فلاں ستارے فلاں جگہ پر پہنچے تب بارش ہوئی، گویا وہ لوگ بجائے اللہ کے ستاروں کی طرف بارش کی نسبت کرتے تھے، اسی لیے آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ بہت سے اللہ کے بندے ایسے ہیں جن کا میرے اوپر ایمان ہے اور بہت سے ایسے بندے ہیں جن کا میرے اوپر ایمان نہیں ہے، آپ ﷺ نے یہ بات اس لیے فرمائی کہ جو لوگ ستاروں پر یقین رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ستاروں سے کام ہوگا وہ گویا اللہ کے منکر ہیں اور اللہ کی قدرت پر یقین نہیں رکھتے ہیں، اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بارش اللہ کے ہاتھ میں ہے، اسی کے حکم سے بارش ہوتی ہے، اور ستاروں کو کوئی دخل نہیں ہے تو وہ لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اور گویا ستاروں کا انکار کرتے ہیں۔

عربوں کا رواج:

عربوں میں یہ رواج تھا کہ وہ نچھتر کی بنیاد پر اپنے فیصلے کرتے تھے، اور ان کو دیکھ کر ہی وہ یہ طے کرتے تھے کہ اب کیا ہونے والا ہے، اگر ان کو کوئی کام کرنا ہوتا تھا تو وہ پہلے ان ستاروں کا مشاہدہ کرتے تھے تاکہ وہ یہ طے کر سکیں کہ جو کام ہم کرنا چاہتے ہیں وہ کام ہمارے لیے مناسب ہے یا نہیں، گویا ان کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ ستارے ایک طرح کا تصرف رکھتے ہیں، اور جب یہ ستارے فلاں جگہ پہنچیں گے تو گویا انہیں کے ذریعہ سے یہ کام ہوگا، اور اگر اس کے مخالف راستہ پر آئیں گے تو یہ کام نہیں ہوگا، یہ ایک خاص قسم کا ان کا تصور تھا، زمانہ جاہلیت میں ایسے بے شمار جاہلی تصورات تھے جن کو اللہ کے رسول ﷺ نے ختم کیا، اسی طرح یہ بھی ایک جاہلی تصور تھا جس کے بارے میں آپ ﷺ نے بتایا؛ یہ بھی ایک مشرکانہ عقیدہ ہے۔

نجومیوں کی بڑ:

زمانہ جاہلیت میں اس عقیدہ کے فروغ کا ایک بڑا سبب علم نجوم سے نجومیوں کی کثرت تھی، اسی لیے اس کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب خرافات اس زمانہ کے نجومیوں کی بڑ تھی، وہ لوگ ستاروں کی بعض علامات دیکھ کر پیشین گوئیاں کرتے تھے، زمانہ جاہلیت میں اس کا بہت رواج تھا، بہت سے لوگ ان کے پاس جاتے تھے اور جا کر پوچھتے تھے کہ ہمارے گھر فلاں مہینہ اور فلاں تاریخ میں شادی مناسب ہے یا نہیں، یا ہم فلاں کام کرنے جا رہے ہیں وہ ہمارے لیے مناسب ہے یا نہیں؟ پھر وہ اس شخص کی کنڈلی دیکھتے تھے اور الٹی سیدھی پیشین گوئیاں کرتے تھے، جیسا کہ ہمارے ملک میں برادران وطن کے یہاں نظام رائج ہے، جو کہ وہی پرانا جاہلی رواج ہے، آج بھی ہندوؤں میں یہ بات عام ہے کہ وہ اپنی شادیاں کرنے سے پہلے اپنے پنڈتوں سے پوچھتے ہیں کہ شادی کے لیے کون سی تاریخ مناسب ہے؟ چنانچہ ان کے پنڈت ان کی کنڈلی دیکھ کر اور دنیا بھر کا حساب لگا کر بتاتے ہیں کہ تمہارے لیے شادی کی فلاں تاریخ مناسب ہے یا نہیں، ظاہر ہے یہ سب لغویات ہیں اور اللہ معاف کرے! بسا اوقات مسلمانوں کے اندر بھی یہ باتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور وہ بھی انہیں بنیادوں پر کام کرتے ہیں اور اللہ کی ذات پر یقین نہیں رکھتے ہیں، جب کہ یہ ایک مشرکانہ عقیدہ ہے، اس لیے ہر صاحب ایمان کا یقین اللہ کی ذات پر ہونا چاہیے، توحید اسی کا نام ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے آدمی یقین رکھے کہ یہ سب اللہ کے کرنے سے ہو رہا ہے، اور اس سلسلہ میں کسی سبب کو دیکھ کر متاثر نہ ہو کہ اس سبب کی وجہ سے کام ہو رہا ہے، بلکہ یہ ذہن میں رکھے کہ اللہ ہی نے اسباب پیدا فرمائے ہیں اور اسباب کا حال یہ ہے کہ ایک سبب ابھی ہم کو نظر آ رہا ہوتا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس سبب کی بنیاد پر فلاں مسبب ہمارے سامنے آ جائے گا، لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہ سبب ہی غائب ہو جاتا ہے، معلوم ہوا اسباب کی کوئی حقیقت نہیں ہیں، اسباب بدلتے رہتے ہیں، اللہ کا یہی نظام ہے۔

بے عقلی کی انتہاء:

آج کے اس علمی ترقی یافتہ دور میں بھی کتنے لوگ ایسے ہیں جو ہاتھ کی لکیریں دکھاتے ہیں اور اپنا مستقبل معلوم کرتے ہیں کہ ہم کو دولت ملے گی یا نہیں ملے گی؟ مستقبل میں ہمارے ساتھ کیا ہوگا؟ اور یہ نہیں جانتے کہ ہاتھ کی لکیریں روز بدلتی ہیں، آج ہاتھ کی لکیریں کچھ ہیں اور کل کچھ ہو جائیں گی، واقعہ یہ ہے کہ جو آدمی ان چیزوں کے چکر میں پڑتا ہے وہ یہ نہیں سمجھتا کہ یہ چیزیں بالکل ریت کی لکیریں ہیں، جیسے ریت کے اوپر جو لکیریں بنائی جاتی ہیں، وہ دن میں ہوتی ہیں اور شام کو ختم ہو جاتی ہیں اور وہاں پر ایک نیا ڈیزائن بن جاتا ہے، ایسے ہی ہاتھ اور پیشانی کی لکیروں کا حال ہے کہ ان میں انسان کو ہر روز نیا ڈیزائن نظر آئے گا، عقل مندی تو یہ ہے کہ اس بات پر یقین رہے کہ اللہ نے ہمارا مستقبل طے کیا ہے، اور اس کو اللہ ہی جانتا ہے، اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

پریشانیوں کا سبب:

یہ دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ ان موہوم باتوں میں پڑتے ہیں ان کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے، وہ مصیبت میں پڑ جاتے ہیں، اور صرف ایک ایک چیز میں غور ہی کرتے رہتے ہیں کہ یہ الٹا ہو رہا ہے یا سیدھا ہو رہا ہے، اس لیے اللہ کی ذات پر یقین ہونا چاہیے، اور یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہی یہ ساری چیزیں رکھی ہیں اور اللہ ہی زیادہ جانتا ہے کہ کون سی چیز مؤثر ہے اور کون سی چیز مؤثر نہیں ہے، یاد رہے اگر کوئی ان چیزوں کے پیچھے پڑتا ہے اور ان

کو مؤثر سمجھتا ہے تو گویا وہ اللہ رب العزت کی ذات کا ایک طرح سے انکار کر رہا ہے اور ان چیزوں پر یہ سمجھ کر ایمان لا رہا ہے کہ ان سے ہمارا کام بن رہا ہے، ظاہر ہے یہ ایک طرح کا شرک ہے، اس لیے ان تمام باتوں سے دور رہنے کی ضرورت ہے اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین رکھنے کی ضرورت ہے۔

علم نجوم:

علم نجوم ایک مستقل فن ہے، اور وہ فن یہ ہے کہ اس کے ماہر لوگ ستاروں کو دیکھ کر سمتیں متعین کرتے ہیں اور راستے طے کرتے ہیں، قرآن مجید میں ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ﴾ (النحل: ١٦) (اور ستاروں سے لوگ راستے پاتے ہیں)

ستاروں سے راستہ پانے کا مطلب یہ نہیں کہ ستاروں کو دیکھ کر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کب بارش ہوگی اور کب نہیں ہوگی، کب فلاں کام ہوگا اور کب فلاں کام نہیں ہوگا، بلکہ اس کا مطلب ہے ستاروں کو دیکھ کر لوگ راستے طے کرتے ہیں، اس لیے کہ اللہ نے ان ستاروں کو ایسا رکھا ہے کہ ان سے سمتیں متعین ہوتی ہیں، ان کو دیکھ کر آدمی صحرا اور سمندر میں سفر کرتا ہے، گرچہ اس زمانہ میں بہت سہولیات ہیں، لیکن قدیم زمانہ میں جب کچھ نہیں تھا، اس وقت صحرا اور سمندر کے سفر میں راستوں کے متعین کرنے کا یہی تنہا ذریعہ تھا کہ لوگ ستاروں کو دیکھتے تھے اور ستاروں کو دیکھ کر یہ سمجھ جاتے تھے کہ ہم کس رخ کی طرف جا رہے ہیں اور ہم کس ملک کا سفر کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے ہم کو کس طرف چلنا چاہیے، درحقیقت یہی وہ علم ہے جس کو علم نجوم کہتے ہیں، یہ علم مطلوب ہے اور مفید بھی ہے، لیکن نجومیوں کی جو پیشین گوئیاں ہوتی ہیں وہ سب مشرکانہ باتیں ہیں اور دین وایمان سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، ان سے بہت دور رہنے کی ضرورت ہے، البتہ اگر کوئی آدمی ستاروں کو دیکھ کر سمتیں متعین کرتا ہے یا اوقات کی تعیین کرتا ہے تو درست ہے۔

سعد و نحس کی بنیاد:

انسانی نظام زندگی میں کئی مواقع پر ستاروں سے مدد ملتی ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کا ایک نظام ہے، جیسے سورج اور چاند ہے، ان کو دیکھ کر مہینے طے ہوتے ہیں، ایام طے ہوتے ہیں، ہفتے طے ہوتے ہیں، اسی طرح ستاروں کو دیکھ کر اوقات طے ہوتے ہیں، سمتیں طے ہوتی ہیں اور رخ طے ہوتے ہیں، گویا یہ ایک مستقل علم ہے، اور اس سلسلہ میں سائنس نے بھی بڑی ترقیاں کی ہیں، ان لوگوں نے نہ جانے کہاں کہاں اور کن کن ستاروں کی کھوج کی ہے، اور اس سے ان کو فوائد بھی حاصل ہوئے ہیں، معلوم ہوا یہ بالکل ایک الگ علم ہے، جس کے سیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن ان ستاروں کو مؤثر سمجھنا، اور ان کو گویا سبب قرار دینا اور یہ سمجھنا کہ فلاں ستارہ فلاں جگہ پہنچے گا تو یہ کام ہوگا، یا فلاں جگہ جنگ چھڑ جائے گی اور فلاں ملک کی قسمت کا ستارہ گردش میں ہے، لہٰذا وہاں کے حالات خراب ہو جائیں گے، جیسا کہ آج کل عام بول چال میں بھی یہ جملہ بہت بولا جاتا ہے، جب کسی کی حالت درست نہ ہو تو اس کو کہا جاتا ہے کہ ''تمہاری قسمت کا ستارہ گردش میں ہے۔''

ظاہر ہے یہ سب لغو باتیں ہیں، واقعہ یہ ہے کہ سب ستارے اللہ کے ہیں، اس کے بنائے ہوئے اور پیدا کیے ہوئے ہیں، وہ جہاں چاہتا ہے ان کو پہنچاتا ہے، ان کے متعین راستے ہیں، ان سے آدمی راستے پا سکتا ہے اور دنیا میں ان کے ذریعہ اپنا سفر آسان کر سکتا ہے، لیکن ان کو متصرف سمجھنا اور ان کے بارے میں یہ تصور کرنا کہ ان سے سعد و نحس کا خاص تعلق ہے، اور جب فلاں ستارہ فلاں منزل میں پہنچتا ہے یا فلاں برج میں پہنچتا ہے تو وہ بڑی مبارک ساعت ہوتی ہے، اگر اس وقت شادی کی جائے تو وہ شادی بڑی مبارک ہوگی، اور جب فلاں ستارہ فلاں جگہ پہنچے گا تو وہ بڑی منحوس ساعت ہوتی ہے، اگر اس وقت شادی کی جائے گی تو وہ شادی منحوس رہے گی، یہ سب لغویات ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ کوئی وقت منحوس ہے اور نہ کوئی وقت مسعود ہے، سارے اوقات اللہ کے ہیں، اور سعد و نحس کا تعلق اعمال سے ہے، لہٰذا جو انسان اچھے اعمال کر رہا ہے وہ اپنے لیے سعادت کا انتظام کر رہا ہے اور جو بداعمالیاں کر رہا ہے وہ اپنے لیے شقاوت یعنی نحس کا انتظام کر رہا ہے، نحس بداعمالیوں سے ہوتی ہے، حاصل بحث یہ کہ ستاروں وغیرہ کو متصرف سمجھنا شرک کا ایک عمل ہے جس سے بہت دور رہنا چاہیے، یہ زمانہ جاہلیت کا دستور تھا، جس کی زمانہ اسلام میں آپ ﷺ نے صراحت سے نفی فرما دی۔

صلاح وفساد کی بنیاد

عبدالسبحان ناخداندوی

قرآن مجید کی اصطلاح میں اللہ تعالیٰ کے وہ تمام احکامات جو اس نے اپنے بندوں کو دیے ہیں اور بندوں کے ذمہ ان کا پورا کرنا واجب ہے "عھد اللہ" یعنی "اللہ کے عہد" میں شامل ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اور اپنی کتابوں کے ذریعہ بندوں پر جو ذمہ داری عائد کی ہے وہ حقیقت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا بندوں سے کیا ہوا عہد ہے، دنیا کا ہر انسان جب بالغ ہوتا ہے تو خود بخود اللہ کے عہد کا پابند ہو جاتا ہے، اس کی اولین ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی صلاحیت کو استعمال کر کے اللہ کی وحدانیت تک پہنچ جائے، اس نتیجہ تک پہنچے بغیر نہ اسے یہ کائنات متوازن نظر آئے گی، نہ اپنی ذات میں کوئی توازن نظر آئے گا، ایک غیر متوازن بے ہنگم قسم کی زندگی اسے بسر کرنی پڑے گی، اللہ کو ایک ماننے پر وہ اللہ کے عہد کے بنیادی مرحلہ کو پار کر لیتا ہے، اس کے بعد احکامات کا سلسلہ اللہ کی طرف سے جاری کیا جاتا ہے جس کو پورا کرنا اس کے ذمہ لازم ہو جاتا ہے، اس کا نام طاعت ہے، اس طاعت سے نکل بھاگنے والے فاسق کہلاتے ہیں، یہی درحقیقت اللہ کے عہد کو توڑنے والے ہیں، ایسے لوگ اگر دنیوی اعتبار سے معمولی جاہ و منصب حاصل بھی کر لیں، اس کے باوجود بھی حقیقی خسارہ میں ہیں، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑنے والوں کا انجام بتاتے ہوئے فرمان الٰہی ہے:

﴿الَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِن بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ﴾ (البقرۃ: ۲۷)

(جو اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور اللہ نے جس چیز کو جوڑنے کا حکم فرمایا ہے اس کو وہ توڑتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے ہیں وہی لوگ نقصان میں ہیں)

نقض؛ کے معنی ہیں کسی مضبوط چیز کو توڑنا اور پارہ پارہ کرنا، یہ حسی و معنوی دونوں چیزوں کو توڑنے کے لیے استعمال ہوتا ہے: "نقضتُ البناء" (میں نے عمارت توڑ دی) کسی بھی عمارت کے ملبے کو "أنقاض" کہتے ہیں، دوسری طرف عہد و پیمان توڑنے کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

من بعد میثاقہ؛ یعنی عہد کی پوری مضبوطی اور استحکام کے بعد، اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ کا عہد کوئی ڈھیلا ڈھالا کام چلاؤ قسم کا عہد نہیں ہے جسے جب چاہا نبا ہا، جب چاہا چھوڑ دیا، یہ ایک انتہائی مضبوط بندھن ہے جس پر مضبوطی سے کاربند رہنا لازم ہے۔

دوسرے یہ کہ اللہ کبھی بھی ڈھیلا ڈھالا عہد نہیں لیتا ہے، وہ کوتاہیوں کو معاف ضرور کرتا ہے، لیکن اس کا لیا ہوا عہد پختہ ہی ہوتا ہے، اسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔

عہد میں کمزوری تین طرح سے پیدا ہوتی ہے:

(۱) عہد لینے والا خود کمزور ہو، (۲) عہد لینے والے کی نگاہ میں عہد کی کوئی حیثیت ہی نہ ہو، (۳) جس سے عہد لیا جا رہا ہے وہ خود عہد کو سمجھ نہ پا رہا ہو، اسے عہد کا یقین ہی نہ ہو۔

مذکورہ آیت میں "من بعد میثاقہ" کہہ کر اللہ نے یہ بتا دیا کہ عہد پختہ ہو چکا ہے، لہٰذا یہ عہد نہایت قابل قدر ہے، عہد لینے والا اللہ ہے اور اس نے اس کائنات کو اپنی نشانیوں سے اس طرح آباد کر رکھا ہے کہ ذرہ سے لے کر آفتاب تک سب اسی کے گن گاتے ہیں اور اس کی وحدانیت کی گواہی دیتے ہیں، انبیاء و کتابوں کے ذریعہ اس نے اپنی نشانیاں اتنی واضح کر دی ہیں کہ اب کسی کے لیے انکار کی گنجائش نہیں، رسول اور ان کی تعلیمات کے بعد اب کسی کے پاس کوئی حجت نہیں، ارشاد الٰہی ہے:

﴿لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ (النساء: ۱۶۵) (تاکہ رسولوں کو بھیجنے کے بعد اللہ کے ذمہ کسی کی حجت باقی ہی نہ رہے)

لہٰذا "من بعد میثاقہ" اللہ کے عہد کے لیے صفت لازمی ہے، اللہ کا کوئی عہد ناپختہ ہو ہی نہیں سکتا۔

اس عہد کو اللہ نے بعض مقامات پر واضح کیا ہے، ارشاد ہے:

﴿أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَن لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ☆ وَأَنِ اعْبُدُونِي هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ﴾ (بنی

آدم! کیا میں نے تم سے اس کا عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی عبادت نہیں کروگے، وہی تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے، بس صرف میری عبادت کرنا، یہی سیدھا راستہ ہے)

میثـــــاق؛ اس عہد کو کہتے ہیں جسے قسم کے ذریعہ اور پختہ کیا جائے، یعنی انتہائی مضبوط عہد، قرآن کریم میں اس مفہوم میں "میثاق" کا استعمال متعدد مقامات پر ہوا ہے، جیسے:

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ﴾(الأحزاب: ۷)
(جب ہم نے نبیوں سے مضبوط عہد لیا)

اسی طرح:﴿وَأَخَذْنَا مِنْهُم مِّيثَاقاً غَلِيظاً﴾(النساء: ۱۵٤)(ہم نے ان سے انتہائی مضبوط نہایت پختہ عہد لیا)

اس لفظ کو مصدری مفہوم یعنی پختگی کے معنی میں بھی لیا جاسکتا ہے، اس آیت میں میثاق اسی معنی میں ہے، یعنی وثوق اور توثیق کے معنی دے رہا ہے، جیسے: میلاد ''ولادت'' کے مفہوم میں اور میعاد ''وعد'' کے مفہوم میں مستعمل ہوتا ہے، "میثـــاقــہ" میں ضمیر اللہ کی طرف بھی لوٹائی جاسکتی ہے، یعنی وہ اللہ کی طرف سے عہد کو نہایت پختہ کرنے کے باوجود اسے توڑتے ہیں۔

یہود و نصاریٰ کے تعلق سے سورۂ بقرہ میں قرآن کریم نے اس عہد کا ذکر کیا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَأَوْفُواْ بِعَهْدِيَ أُوفِ بِعَهْدِكُم﴾(البقرة: ٤٠) (تم میرے عہد کو پورا کرو میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا)

موجودہ توریت میں بھی اس عہد کا تذکرہ ملتا ہے۔

جب انسان اللہ ہی کے عہد کو توڑے گا تو پھر اللہ تعالیٰ نے جسے جوڑے رکھنے کا حکم دیا ہے اسے کاٹنے سے بھی نہیں ہچکچائے گا، اسی لیے آیت بالا میں فرمایا گیا:

﴿وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ﴾ (اور اللہ نے جس چیز کو جوڑنے کا حکم فرمایا ہے اس کو وہ توڑتے ہیں)

اس سے مراد اہل ایمان کے باہمی تعلقات، رشتہ داری اور اس سے بڑھ کر انسان اور اس کے بنانے والے کے مابین تعلق کو کاٹنا ہے۔

رسول اکرم ﷺ حقیقت میں بندوں کو اللہ سے اور انسانوں کو انسانوں سے جوڑنے کے لیے تشریف لائے تھے، ظاہر بات ہے کہ انسان کو انسان سے جوڑنے کی ابتداء رشتوں کو جوڑنے ہی سے ہوسکتی ہے، اس لیے کہ انسان کا سب سے پہلا واسطہ عام طور پر اپنے رشتہ داروں ہی سے پڑتا ہے، اس عظیم مقصد کو پانے کے لیے آنحضرت ﷺ نے اپنی مبارک دعوت کی بنیاد ہی توحید اور صلہ رحمی پر رکھی تھی، توحید، عقائد، اعمال اور عبادات کی جڑ ہے اور صلہ رحمی معاشرت، اخلاق اور معاملات کی اصل ہے، حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، مکی زندگی کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا، بس چار پانچ حضرات ہی اسلام میں داخل ہوئے تھے، آپ نے رسول اکرم ﷺ سے کچھ اہم سوالات کیے، پوچھا: آپ کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا: میں نبی ہوں، عرض کیا: نبی کیا ہوتا ہے؟ ارشاد فرمایا: نبی اللہ کا رسول ہوتا ہے، یعنی نبی اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا پیغمبر ہوتا ہے، انہوں نے پوچھا: کیا واقعی اللہ نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، پھر پوچھا: اللہ نے آپ کو کیا پیغام دے کر بھیجا ہے؟ آپ نے فرمایا: پیغام یہ دے کر بھیجا ہے کہ اللہ کو ایک مانا جائے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے، بتوں کو توڑا جائے اور رشتوں کو جوڑا جائے، یہ مبارک حدیث حقیقت میں اس آیت پر مکمل روشنی ڈالتی ہے، اور ﴿مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ﴾ سے مراد عقیدۂ توحید اور صلہ رحمی ہے، ان دو بنیادوں کو جمع کرنے ہی سے صحیح ''انسانیت'' وجود میں آتی ہے۔

لیکن اگر یہ دونوں بنیادیں مفقود ہوجائیں تو پھر فساد برپا ہوتا ہے، جس کی طرف آیت بالا میں اشارہ موجود ہے:

﴿وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ﴾ (اور زمین میں فساد مچاتے ہیں)

یہ جملہ حقیقت میں "يَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ" کا نتیجہ ہے، فساد حقیقت میں کسی کے حق کو پامال کرنے کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے، اس لحاظ سے فساد کی سب سے بڑی بنیاد شرک ہے، جس کے ذریعہ اس کائنات کے پیدا کرنے والے کے حق کو پامال کیا جاتا ہے، اور فساد کی دوسری بنیاد قطع رحمی ہے جس کے ذریعہ انسانوں کے حقوق پامال کیے جاتے ہیں، اللہ نے یہ زمین انسان کو نہایت صاف و شفاف دی تھی، انسان نے اسے شرک سے آلودہ کیا اور زمین میں بگاڑ کا سلسلہ شروع کیا، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَلَا تُفْسِدُواْ فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَادْعُوهُ خَوْفاً وَطَمَعاً﴾(الأعراف: ٥٦) (زمین کی اصلاح ہوجانے کے

بعداب اس میں فساد نہ مچاؤ، امید وخوف کے ساتھ اللہ کو پکارو)

حقیقت میں اللہ کی بندگی کا اعلان زمین کی اصلاح کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اور دوسرا بڑا ذریعہ صلہ رحمی ہے، جس کے سلسلہ میں یہ آیت رہنمائی کرتی ہے:

﴿فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِن تَوَلَّيْتُمْ أَن تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ﴾ (محمد: ۲۲) (اگر تم ذمہ دار بن جاؤ تو کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ زمین میں فساد مچانا شروع کردو اور اپنے رشتوں کو پورے طور پر کاٹ کر رکھ دو)

فساد کے یہ دونوں ذرائع درحقیقت انسان کو اللہ کی رحمت سے دور پھینک دیتے ہیں، اس لیے پہلی آیت میں فساد سے بچنے کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو پکارنے کی تاکید ہے، اور خدا پرستوں کے لیے یہ اعلان ہے:

﴿إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ﴾ (اللہ کی رحمت ایسے ہی احسان کرنے والوں کے قریب ہوتی ہے)

اسی طرح دوسری آیت میں قطع رحمی کرنے والے انسانیت کش لوگوں کے لیے یہ وعید ہے:

﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ﴾ (محمد: ۲۳) (یہ وہ ہیں جن پر اللہ کی لعنت ہے، اس لیے اللہ نے ان کو بہرا کر کے ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے)

واضح رہے آیت میں اقتدار کو اقرباء پروری کا ذریعہ بنانے کا حکم نہیں ہے، بلکہ اقتدار کے لالچ میں اعزہ واقارب پر بے جا ظلم کرنے کی ممانعت ہے، اس لیے کہ صاحب اقتدار عام طور سے اپنے قریبی رشتہ داروں سے زیادہ خطرہ محسوس کرتا ہے۔

اللہ کے احکامات کی پاسداری نہ کرنے والوں کے انجام کار کو بتاتے ہوئے اخیر آیت میں فرمایا: ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ﴾ (یہی لوگ پورے دیوالیہ ہیں)۔

آیت کے اس ٹکڑے کا اوپر سے نہایت لطیف ربط ہے، عام طور پر حق تلفی کرنے والا اپنے مذموم اغراض کو پورا کرنے کے لیے یہ کام کرتا ہے اور اپنے آپ کو فائدے میں تصور کرتا ہے، قطع رحمی میں یہ خودغرضی بہت نمایاں نظر آتی ہے، اور بے حس انسان اپنے اس طرز عمل سے خوش بھی ہوتا ہے کہ بہت کچھ دوسروں کا مال داب لیا ہے، اسی طرح انسان خدا پرستی سے اسی لیے دور بھاگتا ہے کہ اس میں قدم قدم پر شرعی پابندیاں نظر آتی ہیں، اور بے لگام خواہشات کو لگام دی جاتی ہے، اس لیے ایسا شخص نفس پرستی اور خواہشات کی تکمیل کے لیے جھوٹے خداؤں کا سہارا لیتا ہے، جہاں حلال وحرام کا کوئی تصور ہی نہیں، پھر یہ سمجھتا ہے کہ دنیا بھی بن گئی اور آخرت بھی ہاتھ سے نہ گئی، ایسا شخص کتنا نادان ہے، حقیقت میں یہ شخص کنگال ہے، آیت نے صاف بتادیا کہ فساد فی الارض کی کوشش کرنے والے حقیقت میں محروم ہیں، آخرت کے یقینی محروم اور دنیا میں بھی ان کا انجام اکثر تباہی وبربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا ہے۔

مزید آیت میں یہ بھی بتادیا گیا کہ اللہ سے سررشتہ منقطع ہونے کے بعد انسان کے کاموں کا محور دنیا کی زندگی ہوتا ہے، ان کے کام اسی کے اطراف چکر کاٹتے ہیں، یہ چیز جہاں پیدا ہو وہیں عمل کی حیات ختم ہوئی، عمل زندہ رہتا ہے خالق کائنات سے وابستگی پر، ورنہ اس میں زندگی مفقود رہتی ہے، ایسے لوگوں کا حال قرآن کی زبانی کچھ یوں ہے:

﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ..... يُحْسِنُونَ صُنْعًا﴾ (کیا ہم تمہیں نہ بتلائیں عمل کے برباد کون لوگ ہیں، وہ ہیں جن کی کوششیں دنیاوی زندگی میں بھٹک کر رہ گئیں، جب کہ ان کا خیال یہ تھا کہ وہ بڑے شاندار کام انجام دے رہے ہیں)

اسی طرح انسان اپنے اور اپنے بیوی بچوں کے لیے اللہ کے احکام پامال کرتا ہے، دوسروں کے حقوق مارتا ہے، اغراض کا بندہ بنتا ہے اور مفادات کا پجاری بن کر زندگی گذارتا ہے، مزید اس بنیاد پر اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کرتا ہے، اسی کے متعلق ارشاد الٰہی ہے:

﴿قُلْ إِنَّ الْخَاسِرِينَ الَّذِينَ ..... الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ﴾ (کہہ دیجئے اصل برباد تو وہ ہیں جو اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو قیامت کے دن کھودیں گے، یاد رکھو یہی کھلم کھلا کھو دینا ہے)

درحقیقت اعتدال اور توازن سے نکل جانے کا نام فساد ہے، چاہے انسان کچھ ہٹے یا بہت زیادہ الگ ہوجائے، گویا عدم توازن یا ناہمواری کو ''فساد'' کہا جائے گا، اس کے مقابلہ میں توازن اور اعتدال کو ''صلاح'' کہتے ہیں، جس کے ذریعہ نظام درست رہتا ہے، اسی کا نام استقامت ہے۔

میت کو غسل دلانے کے شرعی احکام

مفتی راشد حسین ندوی

میت کو غسل دلانا زندوں پر واجب کفایہ ہے، یعنی بعض ادا کریں تو بقیہ سے وجوب ساقط ہوجائے گا، اور اگر کوئی بھی ادا نہ کرے تو سب گنہگار ہوں گے۔ (ہندیہ:۱/۱۵۸)

میت کو غسل دلاتے وقت مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھا جائے

۱- جس تخت یا تختہ پر میت کو نہلانا ہو سب سے پہلے اس کو طاق عدد (تین، پانچ یا سات بار) لوبان کی دھونی دی جائے، اس لیے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میت کو دھونی دیا کرو تو تین مرتبہ دیا کرو۔ (مسند احمد)

(ہندیہ:۱/۱۵۸، شامی:۱/۶۳۱)

پھر اس پر میت کو اس طرح لٹایا جائے کہ قبلہ اس کی داہنی طرف ہو، لیکن اگر کوئی دشواری ہو تو جس طرح چاہے لٹا سکتا ہے۔

(ہندیہ:۱/۱۵۸)

پھر میت کو کوئی چادر وغیرہ اڑھا کر اس کے کپڑے اتار لیے جائیں، اور ناف سے لے کر پنڈلی تک کوئی موٹا کپڑا (لنگی وغیرہ) پہنا دیا جائے۔ (شامی:۱/۶۳۱)

پھر غسل دلانے والا اپنے ہاتھ میں دستانہ پہن لے یا کوئی کپڑا لپیٹ لے اور میت کو استنجاء کرائے یعنی میت کی شرم گاہوں کو دھوئے، یہ واضح رہے کہ زندہ شخص ہی کی طرح میت کی شرمگاہ کا دیکھنا یا چھونا ممنوع ہے، لہٰذا غسل دلانے اور استنجاء کرانے میں اس کا خیال رکھنا چاہیے۔ (ہندیہ:۱/۱۵۸، شامی:۱/۶۳۱)

۲- اس کے بعد میت کو وضو کرایا جائے اور اس کو وضو کرانے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے تین بار چہرہ دھلایا جائے، پھر انگلی میں کوئی باریک کپڑا لپیٹ کر یا روئی تر کر کے تین تین بار ہونٹ، داڑھ، مسوڑھے وغیرہ کو صاف کیا جائے، پھر اسی طرح ناک بھی صاف کردے، موت جب حالت جنابت یا حالت حیض ونفاس میں ہوئی ہو تو ناک اور منہ صاف کرنے کا خصوصی اہتمام کرے، اس کے بعد بقیہ وضو نماز کے وضو کی طرح کرادے۔ (شامی:۱/۶۳۲)

وضو کا حکم خود آنحضرت ﷺ نے حدیث میں دیا ہے، آپ نے غسل میت کا طریقہ بتاتے ہوئے یہ بھی فرمایا: غسل کی ابتداء میت کے داہنے حصہ نیز اس کے اعضاء وضو سے کرو۔ (بخاری)

۳- پھر سر اور ڈاڑھی کے بالوں کو خطمی (گل خیرو) یا صابون وغیرہ کسی ایسی چیز سے صاف کردے جس سے صفائی اچھی طرح ہوجاتی ہے، اور اگر بال نہیں ہیں تو صابون وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔

(ہندیہ:۱/۱۵۸)

۴- اب اس کے بعد جسم پر پانی ڈالنا ہے، لہٰذا پانی ڈالنے سے پہلے مناسب یہ ہے کہ ناک اور منہ میں روئی بھر دی جائے، تاکہ یہ اعضاء پانی بھر جانے سے محفوظ رہیں، پھر بیری کے پتے ڈال کر پکایا ہوا نیم گرم پانی لیا جائے، زیادہ گرم پانی استعمال نہ کیا جائے، بس اتنا گرم ہونا چاہیے جتنا زندہ آدمی استعمال کرتا ہے، اور بیری کے پتے ڈال کر پکا ہوا پانی اس لیے لیا جاتا ہے کہ حدیث شریف میں اس کا حکم دیا گیا ہے۔ (بخاری)

اور اس کی حکمت یہ ہے کہ پانی کے اندر صفائی کرنے کی طاقت اس سے بڑھ جاتی ہے، اب ابتداء چونکہ میت کے داہنی حصہ سے کرنا ہے جس کا حدیث شریف میں حکم دیا گیا ہے، لہٰذا میت کو بائیں کروٹ پر لٹا دیا جائے، تاکہ اس کا دایاں حصہ اوپر ہوجائے اور اس پر پہلے پانی پڑے، پھر میت کے سر سے ابتداء کرتے ہوئے پیروں تک تین مرتبہ پانی ڈالا جائے، اگر ضرورت ہو تو طاق عدد میں اس پر اضافہ بھی کیا جاسکتا ہے، اس کا خیال رکھا جائے کہ پانی اس طرح ڈالا جائے کہ میت کی بائیں کروٹ کے نیچے تک پہنچ جائے، پھر میت کو داہنی کروٹ پر لٹا دیا جائے اور مندرجہ بالا طریقہ کے مطابق اور اسی تعداد میں سر سے پیر تک پانی ڈالا جائے، پیٹ پر آہستہ آہستہ ہاتھ کا دباؤ ڈالے اور ملے، اور اگر کوئی نجاست نکلے تو

اس کو دھوڈالے، وضو یا غسل کے اعادہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے، پھر میت کو بائیں کروٹ پر لٹادے، اور اس کے سر سے پیر تک کافور ملا ہوا پانی تین مرتبہ ڈالے، اب غسل مکمل ہوگیا ہے، لہٰذا سارا بدن کسی کپڑے سے پونچھ ڈالے۔ (شامی:۱/۶۳۲-۶۳۳)

چنانچہ حدیث میں حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کی روایت آئی ہے فرماتی ہیں کہ ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ اس وقت تشریف لائے جب ہم آپ کی بیٹی (حضرت زینب رضی اللہ عنہا) کو غسل دلا رہے تھے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ان کو تین بار یا پانچ بار، یا ضرورت ہو تو اس سے بھی زیادہ بار پانی اور بیری کی پتی سے غسل دلاؤ، اور آخری بار کافور (یا فرمایا) کچھ کافور ڈال دو، اور جب فارغ ہوجانا تو مجھے اطلاع کردینا۔ (بخاری ومسلم)

اوپر جو تعداد اور ترتیب بیان کی گئی ہے، وہ مسنون ہے، اگر اس ترتیب کا خیال نہیں رکھا یا صرف ایک دفعہ غسل دلایا تب بھی وجوب ذمہ سے ساقط ہوجائے گا۔

اگر کہیں بیری کے پتے یا اشنان نہ ملے تو نیم گرم خالص سے غسل دلا دینا بھی کافی ہوگا۔ (ہندیہ:۱/۱۵۸، شامی:۱/۶۳۲)

۵- میت کے بالوں میں کنگھی کرنا، یا جسم کے کسی حصہ کے بال یا ناخن کاٹنا منع ہے، سب چیزوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے، البتہ ٹوٹے ہوئے ناخن کو الگ کرنے کی اجازت ہے۔ (ایضا)

غسل کس کو دلانا چاہیے؟

۱- مستحب یہ ہے کہ میت کا قریبی رشتہ دار اس کو غسل دلائے، میت مرد ہو تو مرد رشتہ دار اس ذمہ داری کو ادا کریں، اور میت عورت ہو تو خواتین رشتہ دار، اور اگر رشتہ داروں میں کوئی بھی غسل کے مسائل سے واقف نہ ہو تو کوئی بھی دیندار قابل بھروسہ شخص غسل دلادے، بعض علاقوں میں رشتہ دار اس عمل سے دور رہتے ہیں، اور نائی وغیرہ سے یہ کام کرواتے ہیں، یہ خلاف اولی عمل ہے۔

(الدرالمختار:۱/۶۳۶)

۲- بیوی شوہر کو غسل دلاسکتی ہے: اگر شوہر کا انتقال ہوا ہے تو مردوں کی غیر موجودگی میں اس کی بیوی اس کو غسل دلاسکتی ہے، لیکن بیوی کا انتقال ہوا ہو تو شوہر کے لیے اس کا غسل دلانا احناف کے نزدیک صحیح نہیں ہے، بعض ائمہ اس کی اجازت دیتے ہیں۔

(ہندیہ:۱/۱۶۰، شامی:۱/۶۳۳-۶۳۴)

۳- جب غسل دلانے کے لیے جنس موافق موجود نہ ہو: اگر مرد کا انتقال ہوا اور کوئی مرد نہلانے والا نہیں ہے، صرف عورتیں ہیں تو اگر اس کی محرم عورتیں نہ ہوں تو اسے کسی کپڑے سے تیمم کرادیں، محرم عورتیں جیسے: ماں، بیٹی، بہن، بھانجی یا بھتیجی موجود ہوں تو وہ کپڑے کے بغیر تیمم کرائیں گی۔

اسی طرح عورت کو نہلانے کے لیے عورتیں نہ ہوں تو محرم مرد جیسے: باپ، بیٹا، بھائی، بھتیجہ، بھانجہ بغیر کپڑے کے تیمم کرادے، یہ لوگ نہ ہوں تو نامحرم کپڑے سے تیمم کرائے۔ (شامی:۱/۶۳۵)

بالکل چھوٹی بچی کو اور بالکل چھوٹے بچہ کو عورت بھی غسل دلاسکتی ہے، بالکل چھوٹے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حد شہوت کو نہ پہنچا ہو۔ (ایضا)

۴- مستحب یہ ہے کہ غسل دلانے والا طہارت سے ہو، اگر وہ جنبی، حائض یا نفساء ہو تو غسل دلانا مکروہ تحریمی ہوگا، اگرچہ غسل ہوجائے گا، صرف وضو نہ ہو تو اچھا یہ بھی نہیں ہے، لیکن مکروہ نہ ہوگا۔

(ہندیہ:۱/۱۵۹)

۵- خنثی مشکل (جو نہ مرد ہو نہ عورت) کو غسل دلانے کی اجازت نہ مرد کو ہے نہ عورت کو، اس کو کسی کپڑے سے تیمم کرادیا جائے، اسی طرح خنثی مشکل کے لیے جائز نہیں ہے کہ کسی مرد یا عورت کو غسل دلائے۔ (ہندیہ:۱/۱۶۰)

میت کو غسل دلانے کے متفرق مسائل:

جب میت کا صرف کچھ جسم ملے:

اگر کسی میت کا سر سمیت آدھا جسم ملے، یا بغیر سر کے آدھے سے زیادہ جسم ملے تو اس کو غسل دلایا جائے گا اور جنازہ کی نماز پڑھی جائے گی، ورنہ نہیں۔ (ہندیہ:۱/۱۶۰)

جب میت کا مسلمان ہونا مشکوک ہو:

اگر کوئی میت پائی جائے اور پتہ نہ چلتا ہو کہ یہ مسلمان ہے یا کافر، تو اگر کوئی علامت موجود ہے تو اس کا اعتبار کیا جائے گا، ورنہ اگر دارالاسلام میں ملے تب تو مسلمان مان کر غسل دلایا جائے گا اور نماز پڑھی جائے گی ورنہ نہیں۔ (الدرالمختار:۱/۶۳۴) (باقی صفحہ نمبر ۲۰ پر)

خدا کا خوف

محمد ارمغان بدایونی ندوی

عَنْ ابْنِ مَسْعُوْدٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: رَأْسُ الْحِكْمَةِ مَخَافَةُ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کا خوف حکمت کا سرچشمہ ہے۔
(شعب الایمان: ۷۴۴)

فائدہ:- ''خوفِ خدا'' انسان کے اندر احساس ذمہ داری، خود اعتمادی اور حسن عمل کی استعداد پیدا کرتا ہے، اور انسان کو شیطانی مکر وفریب سے باز رکھتا ہے، خوف خدا کے یہ وہ خواص ہیں جن کے پیش نظر حدیث شریف میں اس کو حکمت کا سرچشمہ اور قرآن مجید میں کامیابی کی شاہ کلید بتایا گیا ہے، ارشاد الٰہی ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ (المائدۃ: ۳۵) (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور اس تک پہنچنے کا وسیلہ تلاش کرو اور اس کے راستہ میں جان کھپاتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ)

اللہ سے ڈر کا جذبہ طویل ریاضتوں یا دشوار گزار مراحل کا متقاضی نہیں ہے، بلکہ ہر وہ صاحب ایمان جو صدق دل سے اللہ و رسول اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو، اس جذبہ کا حامل بن سکتا ہے، اور اس جذبہ کا حامل انسان اپنی زندگی میں کسی مصیبت یا پریشانی کا اضافہ نہیں کرتا بلکہ یہ جذبہ اس کے شعور اور فراست ایمانی کے فروزاں کرنے میں مدد ومعاون ہوتا ہے، اور حق و باطل کی تفریق کرنے کی صلاحیت عطا کرتا ہے، جس کی بنیاد پر ایسا انسان اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقام بلند حاصل کرتا ہے، اور اخروی زندگی میں بیش بہا انعامات کا مستحق قرار پاتا ہے، قرآن میں اللہ سے ڈرنے والوں کے متعلق ارشاد ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ﴾ (الملک: ۱۲) (بلاشبہ جو بن دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں ان کے لیے بخشش ہے اور بڑا اجر ہے) خوف خدا کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ انسان کو استقامت نصیب ہوتی ہے، اور خوشی وغم کے مواقع پر احکامات الٰہیہ کی تعمیل میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، اسی طرح معاشرتی زندگی میں بھی ایمانداری کی صفت ایسے شخص کا لازمی جز بن جاتی ہے، یہاں تک کہ تنہائی میں بھی خدا تعالیٰ کی حدود کا اس کو لحاظ رہتا ہے، اور اگر اس کی ذاتی زندگی میں کوئی ناخوشگوار واقعہ بھی پیش آجائے تب بھی وہ اپنا کارساز حقیقی رب العالمین کے سوا کسی کو نہیں سمجھتا، درحقیقت ایک صاحب ایمان کی زندگی کے یہی وہ امتیازی اوصاف ہیں جو اس کی ایمانی بصیرت و فراست کو غیر معمولی جلا بخشتے ہیں۔

خوف خدا پیدا کرنے کا ایک بڑا ذریعہ آیات الٰہیہ میں تدبر ہے، یعنی آسمان وزمین میں اللہ تعالیٰ کی بے شمار بکھری ہوئی نشانیوں میں غور وفکر کرنا، اس غور وخوض سے انسان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، اور وہ یہ یقین کرلیتا ہے کہ ایک ایسی ذات ضرور موجود ہے جس کے ہاتھ میں کل کائنات کی زمام ہے، قرآن میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا علم رکھنے والوں کو اللہ سے حقیقی ڈرنے والا بتایا گیا ہے ارشاد ہے: ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ (فاطر: ۲۸) (اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں)

جو لوگ اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے اور خود کو خدائی گرفت سے محفوظ سمجھتے ہیں، ان کے اندر یہ زعم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سرزنش سرکشوں اور باغیوں کے لیے ہے، اور ہماری زندگی اسلامی سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مختلف حیثیتوں سے گرفت کرتا ہے، اولاً جان و مال میں نقصان پہنچا کر ان کو اصلاح کے مواقع عطا کرتا ہے، لیکن اگر وہ اس کو محض اتفاقی چیز سمجھتے ہیں تو پھر ایک مرحلہ وہ آتا ہے کہ ایسے لوگوں کی صحیح اور غلط میں تمیز کی صلاحیت بھی سلب ہوجاتی ہے، اور ان کی زندگی کا مقصد سوائے کھانے پینے کے اور کچھ باقی نہیں رہ جاتا، موجودہ دور میں لوگوں کی بڑھتی بے راہ روی اور لامقصدیت کا یہ ایک بنیادی راز ہے کہ وہ محض روایتی زندگی گذارنے پر قانع ہیں، اور معرفت الٰہی یا خوف خدا کے حصول کا کوئی جذبہ ان کے اندر نہیں ہے، اس لیے کہ ان کے پاس اتنا ہی مذہبی علم ہے جو ان کو خاندانی طور پر ورثہ میں حاصل ہوگیا، اگر وہ براہ راست مذہب کے مطالعہ کی فکر کرتے تو یقیناً ان کی زندگی نمونہ کی ہوتی۔

احساسِ مظلومیت کا مرض

محمد نفیس خاں ندوی

ہندستانی مسلمان وہ واحد اقلیت ہیں جن کے مسائل تھمنے کا نام نہیں لیتے، آئے دن گوناگوں مسائل کے بوجھ تلے وہ دبتے ہی جا رہے ہیں، مستقبل کے اندیشے اور نسل نو کی الجھنوں نے انھیں متفکر و ششدر کر رکھا ہے تاہم ان مسائل سے نجات کی راہ ڈھونڈنے میں وہ سرگرم وسرگرداں ہیں، روز بروز کسی نہ کسی عنوان سے سمپوزیم، سیمینار، لکچر اور تقریریں ہوتی رہتی ہیں، مضامین ومقالے لکھے جاتے ہیں، اور ساٹھ سال سے جمع ہونے والے مسائل کو ہر شخص دہراتا رہتا ہے۔

لیکن ان ساری تگ ودو اور کوششوں کا محور یہی رہتا ہے کہ مسلمانوں کے سارے مسائل دوسروں کے پیدا کردہ ہیں اور وہ خود معصوم ہیں، انھیں یقین دلایا جاتا ہے کہ ان کے مخالفین نے ان کی زندگی تنگ کر رکھی ہے، ہر طرف سے ان پر اور ان کی محبوب اقدار پر یورش ہے، ایک یلغار ہے جو چہار طرفہ ہے اور مسلسل ہے، وہ ہر میدان میں آگے بڑھنا چاہتے ہیں لیکن حکومت وقت انھیں آگے بڑھنے نہیں دیتی، ان کو دستوری حقوق حاصل نہیں اور ان کے ساتھ دوسرے درجہ کے شہری کا برتاؤ کیا جارہا ہے، غرض مسلمانوں کی پستی اور ان کے پچھڑے پن میں خود ان کا کوئی دخل نہیں، سارا قصور حکومت کا یا فرقہ پرست تنظیموں کا ہے۔

یہ شکایتیں تسلسل کے ساتھ گذشتہ ستر سالوں سے جاری ہیں، اور اسی مرثیہ خوانی وسینہ کوبی میں ان کے ستر سال گزر گئے، جبکہ ساری دنیا بدل گئی، سارے لوگ بدل گئے، ملک کی دیگر اقلیتیں بدل گئیں لیکن مسلمان صبر وثبات کا پیکر بنے کم وبیش وہیں کھڑے ہیں جہاں سات دہائی پہلے کھڑے تھے۔

اس بات سے انکار نہیں کہ مسلمان اس ملک میں اور تقریباً ساری دنیا میں ظلم کے لیے نشان زد کر دیے گئے ہیں، منصوبہ بندی کے تحت ان کو نشانہ بنایا جاتا ہے اور ان کے خلاف یورشیں کی جاتی ہیں لیکن اس احساس کے بعد ضروری تھا کہ مسلمانوں میں ظلم کا ادراک اور اس کا شعور بیدار ہو جو کہ ایک زندہ قوم کی علامت ہے، ظلم سے واقفیت اور اس کا شعور ایک الگ چیز ہے اور مظلومیت کا احساس بالکل دوسری چیز، پہلی چیز بیداری کی علامت اور ہوشمندانہ منصوبہ بندی کا پہلا قدم ہے جبکہ دوسری چیز مفلوج ذہن کی پیداوار ہے جس کے نتیجہ میں اقبال مندی کی ساری امنگیں اور پیش قدمی کے سارے جذبات ڈھیر ہو جاتے ہیں۔

احساس مظلومیت وہ خطرناک مرض ہے جو مظلوم سے ہاتھ پیر مارنے کی صلاحیت بھی سلب کر لیتا ہے، تبدیلیِ حالات کی تمنا اور انقلاب کی خواہش اس کے قلب وروح میں کوئی تڑپ پیدا نہیں کر پاتی، عزم وحوصلے اس کی زندگی سے رخصت ہو جاتے ہیں اور پھر احساس کمتری اسے گھن کی طرح چاٹ جاتا ہے۔

آج ہندستانی مسلمان اسی احساس مظلومیت کا شکار ہیں، جس کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ مسلمانوں نے خود احتسابی کو بالکل فراموش کر دیا، چنانچہ سیاسی مسائل ہوں یا معاشی فساد، اخلاقی بحران ہو شعائر اسلام کی پامالی وہ ہر مصیبت کا سبب دشمنوں کی ریشہ دوانیوں میں تلاش کرتے ہیں حتی کہ نکاح وطلاق اور وراثت جیسے خالص مذہبی معاملات سے غفلت کو بھی دشمنوں کی سازش قرار دیتے ہیں، جبکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ سیاسی سطح پر دشمن کی منصوبہ بندی اور اس کی سازشیں ہمارے اوپر اثر انداز ہوسکتی ہیں لیکن معاشرتی، تعلیمی اور تہذیبی میدانوں میں مجموعی ابتری کے ذمہ دار خود مسلمان ہیں، ہمارا تعلیمی نظام، ہماری سوسائٹی اور ہماری معاشرت ہر زاویہ سے ہماری پستی وذلت اور ہماری غفلت وعدم احتساب کی کھلی ہوئی مثال ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ مسلمانوں نے احساس مظلومیت میں اپنا نصب العین، طریقۂ عمل اور اپنی سمت منزل کو فراموش کر دیا، وہ بھول بیٹھے کہ ان کی حیثیت خلیفۃ الارض کی ہے، وہ خیر کے داعی اور شر کے ماحی ہیں، حالات کی لہروں پر بہنا ان کا کام نہیں، ان کا کام حالات کا رُخ موڑنا ہے، ہاں! اگر ان کو تھوڑا بہت کچھ یاد ہے تو بس یہ کہ ان کے آباء واجداد اس ملک کے بادشاہ تھے اور انھوں نے آٹھ سو سال تک حکومت کی ہے، اس لیے کبھی کبھی ان کے اندر ''پدرم سلطان بود'' کا جوش سلطانی ضرور پیدا ہو جاتا ہے لیکن جب ''سچر کمیٹی'' کا آئینہ نظر آتا ہے تو سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔

مظلومیت کے احساس نے مسلمانوں کے مزاج میں دو اہم تبدیلیاں پیدا کردی ہیں؛ ایک بدگمانی اور دوسرے احساس کمتری، چنانچہ ایک طرف وہ اپنے دینی وسیاسی قائدین سے اکثر بدگمان بلکہ متنفر رہتے ہیں اوران کی سالوں کی بے لوث خدمات کو کسی افواہ یا الزام کی بنیاد پر یکلخت فراموش کردینے میں کوئی تامل نہیں کرتے حتی کہ خالص فکری وسیاسی مسائل میں اصحاب علم واہل قیادت کے اختلاف رائے کو اغیار کی سازش اور فرقہ پرستوں کا شاخسانہ قرار دینے سے نہیں چوکتے۔اور دوسری طرف ہر نئی حکومت کے تعلق سے وہ خوش فہمیوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور ایک مایوس، بے بس اور مجبور قوم کی طرح نوازشوں اور کرم فرمائیوں کی آس لگا بیٹھتے ہیں۔

مسلمانوں کے مسائل کی بنیادی وجہ دین سے دوری اور اس کے احکام سے انحراف ہے، سوچ اور تدبر کے اعتبار سے بھی ان کا طریقۂ کار غیر دانشمندانہ ہے، ان کے سامنے درجنوں مسائل ہیں لیکن آج تک وہ ان مسائل کے تعلق سے ترجیحات طے نہیں کرسکے کہ ان میں سے چند اہم ترین بنیادی مسائل کو منتخب کرکے پوری فکری وعملی قوت ان پر مرتکز کی جاسکے، وہ بیک وقت سارے مسائل کی فہرست تو پیش کردیتے ہیں لیکن کام کی ابتداء کہاں سے کی جائے یہ طے نہیں کرپاتے، جس کے نتیجہ میں اضطراب بڑھتا جاتا ہے اور مسائل کی گتھی مزید الجھ کر رہ جاتی ہے، اس لیے عملی شکل یہ ہے کہ پہلے کوئی ترجیحی ایجنڈا طے کیا جائے اور اس کا لائحۂ عمل تیار کرکے اس میں رنگ بھرنے کی کوشش کی جائے، لیکن اس کے لیے سب سے پہلے احساس کمتری کو دور کرکے خود اعتمادی کو پروان چڑھانا ہوگا، دشمنوں کی سازشوں کا رونا رونے کے بجائے ان کے مقابلہ کی فکر کرنی ہوگی، اور پوری فکری قوت وعملی طاقت کے ذریعہ دفاع کے بجائے اقدامی پوزیشن اختیار کرنی ہوگی، اور یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب ہمارے دلوں سے مظلومیت کا احساس کافور ہوگا اور ہم خود اپنا محاسبہ ایک زندہ وجاوید قوم کی طرح کریں گے، اوراس کے لیے دینی تعلیمات سے عملی واقفیت کے ساتھ آخرت کا مضبوط عقیدہ ضروری ہے، ورنہ مسائل آتے رہیں گے اور ہم اپنی مظلومیت پر ماتم کناں رہیں گے۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت بدلنے کا

بقیہ: میت کو غسل دلانے کے شرعی احکام

جب مسلم غیر مسلم مردے مل جائیں:

مسلمان اور کافر مردے مل جائیں اور کسی علامت سے تمیز ممکن نہ ہو تو غسل سب کو دلایا جائے گا اور راجح یہ ہے کہ نماز بھی سب کی پڑھی جائے گی۔(شامی:۱/۶۳۵)

جب میت پانی میں ملے:

اگر کسی کی موت پانی میں ڈوب کر ہوئی، یا مرنے کے بعد اس کو قاتلوں نے پانی میں ڈال دیا تب بھی اس کا غسل دلانا واجب ہے۔(شامی:۱/۶۳۴)

جب پانی دستیاب نہ ہو:

اگر غسل دلانے کے لیے پانی دستیاب نہ ہو تو تیمم کرا دیا جائے، تیمم کرانے کے بعد دفن سے پہلے پانی دستیاب ہوجائے تو غسل دلایا جائے۔(ہندیہ:۱/۱۶۰)

جب میت کی کوئی خوبی یا عیب نظر آئے:

اگر میت کی کوئی خوبی نظر آئے، مثلا: چہرہ میں شادابی اور رونق ہو تو اس کا تذکرہ کرنا اچھا ہے، لیکن کوئی عیب نظر آئے تو اس سے چشم پوشی کرے، اور کسی سے تذکرہ نہ کرے، اس لیے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا: اپنے مردوں کی خوبیاں بیان کیا کرو، اوران کے عیوب سے چشم پوشی کیا کرو۔(ابوداؤد)

البتہ مرنے والا اگر زندگی میں کسی کھلی گمراہی یا بے راہ روی کا شکار رہا ہو تو دوسروں کی عبرت کی غرض سے اس کا عیب بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔(ہندیہ:۱/۱۵۹، شامی:۱/۶۳۶)

ضروری مسئلہ:

میت کو غسل دلانے کے بعد بھی غسل کرلینا مستحب ہے، اس لیے کہ حدیث شریف میں اس کا حکم دیا گیا ہے، لیکن فرض یا واجب نہیں ہے۔(شامی:۱/۶۳۶)

اگر بغیر اجرت غسل دلانے والا نہ ملے تو اجرت دے کر غسل دلایا جاسکتا ہے، لیکن غسل دلانے والے کے لیے اجرت لینا معیوب بات ہے۔(شامی:۱/۶۳۴)

گناہ چھوڑنے کی ایک تدبیر

مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ

اگر رفتہ رفتہ برے کام چھوڑنے کی تدبیر پر عمل کیا جاتا رہے تو یہ ناممکن نہیں کہ رفتہ رفتہ انسان کے اعمال بد میں نمایاں کمی نہ آتی چلی جائے، مثلاً: کوئی شخص سود خوری، مکر وفریب، جھوٹ، غیبت، بدنگاہی، بد زبانی اور اس طرح کے سو گناہوں کو بیک وقت نہیں چھوڑ سکتا، لیکن کیا یہ بات اس کی قدرت میں نہیں ہے کہ وہ ان گناہوں میں سے کسی ایک آسان چیز کا انتخاب کر کے اسے چھوڑنے کا عزم کر لے، اور باقی پر استغفار کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور ان سے نجات کی دعا کرتا رہے؟ اگر وہ دن بھر میں پچاس جگہوں پر جھوٹ بولتا ہے تو آئندہ کم از کم دس مقامات پر جھوٹ چھوڑ دے، اگر روزانہ پانچ سو روپے ناجائز طریقوں سے حاصل کرتا ہے تو ان میں سے جتنے کم سے کم آسانی سے چھوڑ سکتا ہو، کم از کم انہیں چھوڑ دے، اگر دن بھر میں کبھی ایک نماز نہیں پڑھتا تو پانچوں اوقات میں سے جو وقت آسان تر معلوم ہو کم از کم اس میں نماز شروع کر دے، اور باقی کے لیے دعا و استغفار کرتا رہے۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح بھڑکی ہوئی آگ سے بھاگتے وقت انسان یہ نہیں دیکھتا کہ بھاگ کر میں کتنی دور جا سکوں گا؟ بلکہ وہ بے ساختہ بھاگ ہی پڑتا ہے اور اگر آگ اسے دبوچ ہی لے تو جب تک اس کے دم میں دم ہے وہ جسم کے جتنے زیادہ سے زیادہ حصے کو اس سے بچا سکتا ہے، بچاتا ہی رہتا ہے، اسی طرح دین کے معاملے میں بھی فکر یہ ہونی چاہیے کہ جس گناہ سے جس وقت بچ سکتا ہوں، بچ جاؤں اور جس نیکی کی توفیق جس وقت مل رہی ہے کر گزروں، اگر ہم اور آپ اس طرز پر عمل پیرا ہو جائیں تو انشاء اللہ ایک نہ ایک دن اس آگ سے نجات مل کر رہے گی، لیکن ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر اس آگ کو زبانی صلواتیں ہی سناتے رہیں تو پھر اس سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں۔

R.N.I. No.
UPURD/2009/28748

Monthly
Payam-e-Arafat
Raebareli

Postal Reg. No.
RBL/NP -19

Volume: 10 | MARCH 2018 | Issue: 03

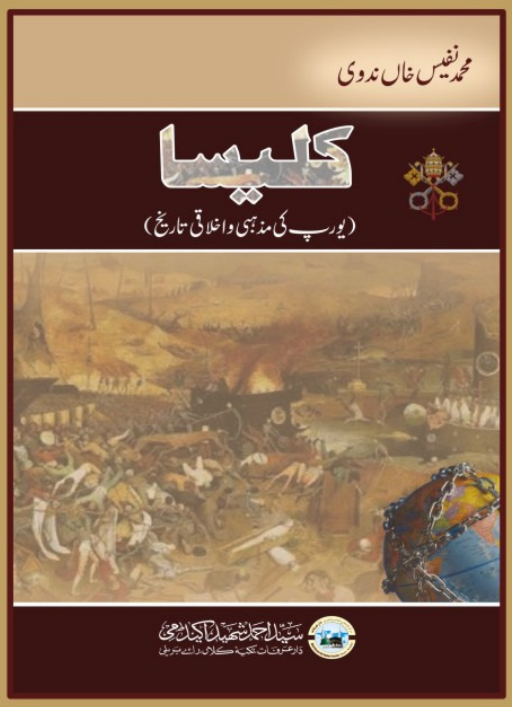

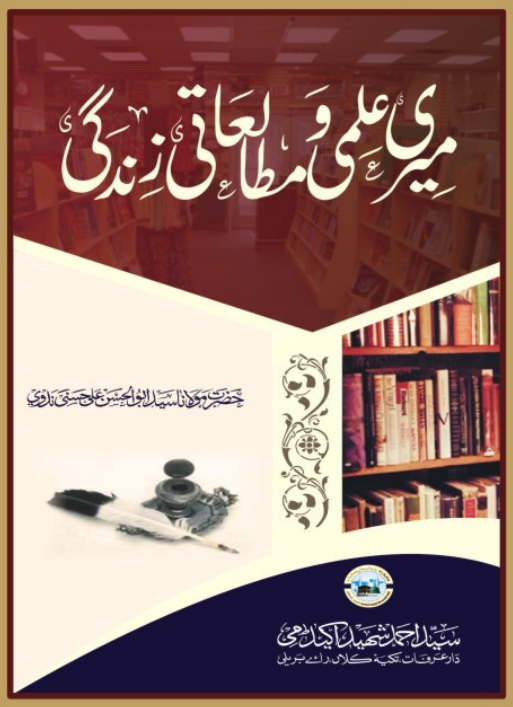

DECLARATION OF OWNERSHIP AND OTHER DETAILS
FORM 4 RULE 8

Name of Paper:	Payam e Arafat
Place of Publication:	Raebareli
Periodicity of Publication:	Monthly
Chief Editor:	Bilal Abdul Hai Hasani Nadwi
Nationality:	Indian
Address:	Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi Dare Arafat, Takiya Kalan, Raebareli (U.P.) 229001
Printer/Publisher:	Mohammad Hasan Nadwi
Nationality:	Indian
Address:	Maidanpur, Post. Takiya Kalan, Raebareli (U.P.) India
Ownership:	Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi

I, Mohammad Hasan Nadwi, printer/publisher declare
that the above information is correct
to the best of my knowledge and belief.

(March 2018)

Editor: Bilal Abdul Hai Hasani Nadwi
MARKAZUL IMAM ABIL HASAN AL-NADWI
E-Mail: markazulimam@gmail.com - Dare Arafat, Takiya Kalan, Raebareli (U.P.) 229001 - Mobile: 9565271812
Printed & Published by: Mohammad Hasan Nadwi, On Behalf of Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi.
Printed at S.A. Offset Printers, masjid ke Peeche, Phatak Abdullah Khan, Sabzi Mandi, Station Road, Raebareli (U.P.)